تعلیم و تربیت
اپریل 2015ء
تین شہزادے
ایک شہزادی
صفحہ نمبر 57

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

شاہ جہاں اور سرسید احمد خاں دونوں مسلمان تھے، ایک بادشاہ تھا اور دوسرا فقیر بادشاہ۔ بادشاہ کا خزانہ دلیز تک لبالب بھرا تھا۔ اس کے دور میں ہندوستانی روپیہ برطانیہ کے چار پاؤنڈ کے برابر تھا اور اس کی بھجوائی ہوئی زکوٰۃ مکہ اور مدینہ میں تقسیم ہوتی تھی۔ اس کے خاندان کی ایک بچی بیمار ہوئی تو برطانیہ سے ڈاکٹر بلوایا گیا۔ ڈاکٹر کے علاج سے بچی ٹھیک ہوگئی۔ بادشاہ نے ڈاکٹر سے پوچھا: ''مانگو کیا مانگتے ہو؟'' ڈاکٹر نے جھک کر عرض کیا: ''آپ میری قوم کو ہندوستان کے ساتھ تجارت کی اجازت دے دیں۔'' بادشاہ نے ہاں میں گردن ہلائی اور یوں برطانیہ کے لوگوں پر ہندوستان کے دروازے کھل گئے اور یہ اس دور کی سب سے بڑی سفارتی ڈیل تھی۔

بادشاہ شہزادگی کے دور میں شہزادہ خرم تھا لیکن جب بادشاہ بنا تو شاہ جہاں کہلایا۔ اس دور میں ہندوستان پہنچنا دُنیا بھر کے لوگوں کی آخری خواہش ہوتی تھی۔ بادشاہ کی ایک ملکہ تھی، ارجمند بانو۔ یہ ملکہ بادشاہ کے پہلو میں پہنچ کر ممتاز محل ہوگئی۔ بادشاہ کو ملکہ سے اس قدر محبت تھی کہ اس نے قسم کھائی کہ وہ دُنیا میں محبت کی ایک نشانی چھوڑ جائے گا جو محبت کے جذبے سے بھی بلند ہوگی۔ بادشاہ کی اس قسم کے بطن سے بعدازاں تاج محل نے جنم لیا۔ محل پر 20 ہزار مزدوروں اور کاری گروں نے بیس سال تک کام کیا۔ محل کے لیے سترہ ممالک سے سنگِ مرمر منگوایا گیا۔ محل کی دیواروں میں 35 قسم کے قیمتی پتھر لگائے گئے۔ تاج محل پر کتنا سرمایہ خرچ ہوا؟ اس کے بارے میں دو روایات پائی جاتی ہیں۔ ایک روایت کے مطابق تاج محل پر تین کروڑ 20 لاکھ روپے جب کہ دوسری روایت کے مطابق 6 کروڑ 52 لاکھ روپے خرچ ہوئے۔ پہلی روایت درست ہو یا دوسری لیکن یہ طے ہے یہ رقم اس وقت پورے یورپ کے جی ڈی پی سے زیادہ تھی۔ اس وقت آکسفورڈ اور کیمبرج دونوں یونیورسٹیوں کی مالیت بارہ لاکھ روپے بنتی تھی۔ بہرحال بادشاہ کامیاب ہوگیا اور آج پوری دُنیا تاج محل اور شاہ جہاں دونوں کو جانتی ہے، لہٰذا بادشاہ نے اپنی منزل پالی۔

شاہ جہاں کے مقابلے میں دوسرا مسلمان غریب اور مسکین شخص تھا۔ اس کے بزرگ شاہ جہاں کے دور میں ایران سے ہندوستان آئے تھے۔ یہ ایسٹ انڈیا کمپنی میں معمولی کلرک بھرتی ہوئے، کلرکی کے دوران منصفی کا امتحان پاس کیا اور 1841ء میں جج بھرتی ہوگئے۔ یہ ہندوستان کے مسلمانوں کی غلامی کا دور تھا۔ مسلمانوں نے آزادی کی جنگ ہار دی تھی۔ بادشاہت ختم ہوگئی تھی، حکمران غلام بن گئے تھے اور انگریز ان کے آقا۔ غلامی کے اس دور میں ماضی کے اس کلرک اور حال کے سول جج نے بھی ''تاج محل'' بنانے کا فیصلہ کیا مگر وہ ایک ایسا تاج محل بنانا چاہتا تھا جس کے سامنے شاہ جہاں کا تاج محل گہنا جائے لیکن اس کے پاس شیرازی جیسے آرکی ٹیکٹ تھے، 20 ہزار مزدور کاری گر اور معمار تھے اور نہ ہی 6 کروڑ 52 ہزار روپے۔ اس کے پاس اکیلی جان، پھٹی ہوئی جیب، گھسے ہوئے جوتے اور کپڑے کی میلی ٹوپی تھی۔ وہ یہ سامان لے کر باہر آگیا۔ اس نے علی گڑھ میں مسلمانوں کے لیے ہندوستان کا پہلا انگریزی اسکول بنانے کا اعلان کر دیا۔ اس نے اپنے آپ کو جھولی بنا دیا۔ یہ کشکول بن کر ہر اس مسلمان کی دلیز پر گیا جس کے گھر سے ایک مٹھی آٹا مل سکتا تھا۔ اس کے اندر بھی شاہ جہاں جتنا جوش، جذبہ اور جنون تھا اور یہ جنون اور جذبہ بالآخر پہلے علی گڑھ اسکول، پھر علی گڑھ کالج اور آخر میں علی گڑھ یونیورسٹی کی شکل میں سامنے آیا۔ یہ ہندوستان کے مسلمانوں کا پہلا جدید تعلیمی ادارہ تھا اور اس کے بارے میں کہا جاتا ہے، یہ ادارہ نہ ہوتا تو شاید آج پاکستان بھی نہ ہوتا اور ہم آج انگریزوں کے غلام ہوتے یا پھر ہندوستان کے ہندوؤں کی غلامی کر رہے ہوتے۔ یہ سرسید احمد خاں تھا جس نے اس خطے کے ہر مسلمان کے دل میں علم کا ایک ایسا تاج محل تعمیر کیا جس نے اسے سوچنے، آگے بڑھنے اور دُنیا کے سر سے تاج اُٹھا کر اپنے سر پر رکھنے کا جذبہ دیا۔ آج دُنیا میں جہاں بھی محلوں کی فہرست بنتی ہے تو اس فہرست میں تاج محل کا نام ضرور لکھا جاتا ہے اور جہاں بھی تعلیمی اداروں کا ذکر آتا ہے تو اس میں سرسید احمد خان کی یونیورسٹی کا نام بھی ضرور شامل ہوتا ہے لیکن ہم اگر 2015ء میں بیٹھ کر شاہ جہاں اور سرسید احمد خان کی شخصیت کا تجزیہ کریں تو ہمیں سرسید احمد خاں، شاہ جہاں سے کئی درجے بلند انسان دکھائی دیتے ہیں۔

شاہ جہاں ایک بادشاہ تھا جس نے ایک عورت کی محبت میں اپنے خزانوں کے دروازے کھول دیے، جس نے محبت کا تاج محل خرید لیا، جب کہ سرسید احمد خاں ایسا فقیر تھا جس نے ایک مٹھی بھر آٹا جمع کر کے علم کا ایک ایسا تاج محل تعمیر کیا جس نے اس خطے کے مسلمانوں کو علم سے محبت کا تحفہ دیا، جس نے اس خطے کے مسلمانوں کو بتایا محبت کی اصل نشانی شاہ جہانوں کے تاج محل نہیں ہوا کرتے، سرسید احمد خان جیسے لوگوں کے علی گڑھ ہوتے ہیں۔ جس نے بتایا شاہ جہاں جیسے بادشاہوں کی حکومت اور محبت چند برسوں کا چراغ ہوتی ہے لیکن سرسید جیسے قلندروں کی محبت کا چراغ کبھی نہیں بجھتا۔

پیارے بچو! اگر آپ کو تاج محل تعمیر کرنے کا موقع ملے تو آپ کون سا تاج محل تعمیر کرنا پسند کریں گے، آگاہ کیجیے گا۔ فی امان اللہ! (ایڈیٹر)

ایڈیٹر، پبلشر
ظہیر سلام

اسسٹنٹ ایڈیٹر
عابدہ اصغر

سرکولیشن اسسٹنٹ
محمد بشیر راہی

اس شمارے میں

عنوان	مصنف	صفحہ
اداریہ	مدیر	1
حمد و نعت	خالد بزمی	2
درسِ قرآن و حدیث	محمد طیب الیاس	3
یارِ غار حضرت ابوبکر صدیقؓ	غلام حسین میمن	4
زیادتی	علی اکمل تصور	6
پیارے اللہ کے......	راشد علی نواب شاہی	9
دولت کا پجاری	سید انیس احمد	11
اجلا بچپن، روشن بڑھاپا	شیخ عبدالحمید عابد	16
کھڑکھاند گروپ	فتح محمد عرشی	19
آیئے مسکرایئے	باذوق قارئین	24
میری زندگی کے مقاصد	پُرعزم قارئین	25
مختصر مختصر	ننھے لکھاری	26
بچوں کا انسائیکلوپیڈیا	ڈاکٹر طارق ریاض	28
اوجھل خاکے		30
دماغ لڑاؤ	ادارہ	31
محاورہ کہانی	زبیدہ سلطانہ	32
نظمیں	صوفی غلام مصطفیٰ تبسم	33
مادام رتھ فاؤ کورین		34
کھیل دس منٹ کا		35
ذائقہ کارنر		36
خطرناک سمندری بوڑھا	کاشف ضیائی	37
آئس ہاکی	عبدالوحید مزاج	40
میری بیاض سے	پسندیدہ اشعار	41
بوجھو تو جانیں	ننھے قارئین	42
اور ٹرین چھوٹ گئی!	گلاب خان سولنگی	43
آپ بھی لکھیے	ننھے ادیب	47
سانجھا غم	عارف شیخ روہیلہ	51
کچھ تو کرو	صالحہ محبوب	53
ایڈیٹر کی ڈاک		55
تین شہزادے، ایک شہزادی		57
کھوج لگایئے!		61
مالدیپ		62
بلاعنوان		64

اور بہت سے دل چسپ تراشے اور سلسلے

سرورق: تین شہزادے، ایک شہزادی

خط و کتابت کا پتا

ماہنامہ تعلیم و تربیت 32۔ ایمپریس روڈ، لاہور۔
UAN: 042-111 62 62 62 Fax: 042-36278816
E-mail:tot.tarbiatfs@gmail.com
tot tarbiatfs@live com

پرنٹر: ظہیر سلام
مطبوعہ: فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، لاہور۔
سرکولیشن اور اکاؤنٹس: 60 شاہراہِ قائداعظم، لاہور۔

سالانہ خریدار بننے کے لیے سال بھر کے شماروں کی قیمت پیشگی بنک ڈرافٹ یا منی آرڈر کی صورت میں سرکولیشن منیجر: ماہنامہ ''تعلیم و تربیت'' 32۔ ایمپریس روڈ، لاہور کے پتے پر ارسال فرمائیں۔
فون: 36361309-36361310 فیکس: 36278816

پاکستان میں (بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک)=850 روپے۔
مشرقِ وسطیٰ (ہوائی ڈاک سے)=2400 روپے۔
ایشیا، افریقا، یورپ (ہوائی ڈاک سے)=2400 روپے۔
امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا، مشرقِ بعید (ہوائی ڈاک سے)=2800 روپے۔

قیمت فی پرچہ: 30 روپے

حمد باری تعالیٰ

زبانِ خلق پہ ہر دم جو نام ہے تیرا
مقامِ ہُو سے بھی آگے مقام ہے تیرا

تو ہی ہے واقفِ رازِ جلی و رازِ خفی
کلامِ حق ہی کا مطلب کلام ہے تیرا

ترے نثار ترے دم سے ہے یہ زینت دیں
خلوص و زہد و محبت پیام ہے تیرا

تری ہی ذات سے قائم ہے یہ نظامِ جہاں
ہر ایک ذرۂ عالم غلام ہے تیرا

ترے کرم سے ہی ہوتی ہے حل ہر اک مشکل
بنانا دہر کی بگڑی کو کام ہے تیرا

نعت رسول مقبول ﷺ

حمید و حامد و احمدؐ محمدؐ مصطفیٰ تم ہو
رؤف و حافظ و برہان و محبوبِ خدا تم ہو

حکیم و نُور و محمود و جواد و عادل و رحمت
عزیز و طاہر و قاسم، خلیل و مجتبیٰ تم ہو

امین و صادق و مختار و یٰسین و مدثر ہو
حبیب و ناطق و قائم نصیر و منتہیٰ تم ہو

مکیں ہو اور مطلوب و نذیر و فخرِ آدم ہو
تو سلطانِ عرب ختمِ رُسُل خیر الوریٰ تم ہو

زمانے بھر کو دیکھا ہے نہیں اپنا کوئی بنتا
بس اب تاجِ شکستہ دل کا حضرت آسرا تم ہو

خالد بزمی

پیارے بچو! آپ جانتے ہیں کہ آخری دو سورتیں جن پر قرآنِ پاک مکمل ہو جاتا ہے سُوْرَۃُ الْفَلَقِ اور سُوْرَۃُ النَّاسِ ہیں۔ ان سورتوں میں اللہ تعالیٰ سے پناہ طلب کی گئی ہے ہر قسم کے شر سے، خواہ وہ شر پہنچانے والے انسان ہوں یا جنات، حیوانات ہوں یا جمادات، پھاڑ کھانے والے جانور ہوں یا ڈسنے والے سانپ اور بچھو، جلانے والی آگ ہو یا ڈبونے والا پانی۔ اور پناہ طلب کی گئی ہے اندھیری رات کے شر سے، جادوگر اور جادوگرنیوں کے شر سے، حسد کرنے والوں کے شر سے اور وسوسہ ڈالنے والے شیطانوں اور انسانوں کے شر سے۔ اسی لیے قرآنِ کریم کی یہ آخری دو سورتیں مُعَوِّذَتَیْنِ کہلاتی ہیں، جن میں بہت سے شرور سے پناہ مانگی گئی ہے۔

احادیثِ مبارکہ میں ان دو سورتوں کے بہت سے فضائل اور فوائد مذکور ہیں: (1) حفاظت کا بہترین سامان: حضرت عقبہ بن عامرؓ بیان کرتے ہیں کہ میں ایک سفر میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھا کہ اچانک آندھی آئی اور سخت اندھیرا ہم پر چھا گیا۔ رسول اللہ ﷺ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ پڑھ کر اللہ تعالیٰ کی پناہ لینے لگے اور مجھ سے ارشاد فرمایا: ”اے عقبہ! تم بھی یہ دو سورتیں پڑھ کر اللہ تعالیٰ کی پناہ حاصل کرو کیوں کہ ان جیسی اور کوئی چیز نہیں ہے جس کے ذریعہ کوئی پناہ لینے والا پناہ حاصل کرے۔“

(ابو داؤد، باب فی المعوذتین:1463)

نبی پاک ﷺ نے اپنے صحابی کو تعلیم دی کہ خوف کے موقع پر ان مبارک سورتوں کو پڑھ لیا کرو، نیز فرمایا کہ پناہ لینے کے لیے یہ بے مثال الفاظ ہیں۔

(2) ہر تکلیف دہ چیز سے حفاظت: حضرت عبد اللہ بن خُبیبؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہم رسول اللہ ﷺ کو تلاش کرنے کے لیے نکلے ایک ایسی رات میں جس میں بارش ہو رہی تھی اور سخت اندھیرا چھایا ہوا تھا تاکہ آپؐ ہمیں نماز پڑھائیں۔ چناں چہ ہم نے آپؐ کو پا لیا۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا: ”کہو!“ عبداللہ بن خبیبؓ کہتے ہیں، میں چپ رہا۔ آپؐ نے پھر ارشاد فرمایا: ”کہو!“ میں چپ رہا۔ آپؐ نے پھر ارشاد فرمایا: ”کہو!“ میں نے عرض کیا: ”یا رسول اللہ! کیا کہوں؟“ ارشاد فرمایا: ”صبح شام قُلْ ھُوَاللّٰہُ اَحَدٌ، قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ تین تین مرتبہ پڑھ لیا کرو، یہ سورتیں ہر چیز سے تمہاری حفاظت کریں گی۔ (ترمذی، ابواب الدعوات:3575)

(3) بے مثال آیات: حضرت عقبہ بن عامرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”کیا تمہیں معلوم نہیں کہ آج رات جو آیتیں مجھ پر نازل کی گئیں، ان جیسی آیات دیکھنے میں نہیں آئیں۔ وہ (آیات) قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ہیں۔“ (مسلم، باب فضل قرأۃ المعوذتین:814)

ایک روایت میں ہے کہ توریت، انجیل، زبور اور قرآن میں بھی قُلْ ھُوَاللّٰہُ اَحَدٌ، قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ جیسی کوئی دوسری سورت نہیں ہے۔ (تفسیر ابن کثیر 8/502)

(4) رات سوتے وقت کا مسنون عمل: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا معمول تھا کہ جب رات کو سونے کے لیے بستر پر دراز ہوتے تو دونوں ہاتھوں کو ملاتے اور قُلْ ھُوَاللّٰہُ اَحَدٌ، قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ پڑھ کر اپنے مبارک ہاتھوں پر دم فرماتے۔ پھر ان ہاتھوں کو تین مرتبہ پورے جسم پر پھیر لیتے۔ پہلے سر اور چہرے اور جسم کے سامنے کے حصے پر پھیرتے تھے۔

(ابو داؤد، باب، مایقال عند النوم:5056)

(5) ہر فرض نماز کے بعد کا عمل: حضرت عقبہ بن عامرؓ نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے حکم دیا کہ ہر نماز کے بعد مُعَوِّذَاتِ (یعنی قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ) پڑھا کرو۔

(نسائی، باب الامر بقرأۃ المعوذات بعد التسلیم:1336)

پیارے بچو! یہ دو سورتیں رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرامؓ کا معمول تھیں۔ یہ حفاظت کا بہترین سامان اور مضبوط قلعہ ہیں، تو کیوں نہ ہم بھی اس مضبوط قلعہ میں پناہ لے لیں؟ ☆☆☆

انہوں نے بڑے ہو کر ابوبکر کنیت اختیار کی۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ بچپن ہی سے بے داغ کردار کے مالک تھے۔ طبیعت کے سادہ، نیک اور خوش اخلاق تھے۔ ہمیشہ سچ بولتے تھے۔ جھوٹ سے انہیں سخت نفرت تھی۔ وہ نہ کبھی گلیوں اور بازاروں میں بے مقصد گھومتے تھے اور جب کبھی بازار سے گزر ہوتا تو ہمیشہ نظریں نیچی رکھتے تھے۔ کبھی شراب کے قریب بھی نہیں گئے۔ یہی وجہ تھی کہ بچپن سے لوگ انہیں بے حد عزت اور احترام سے دیکھتے تھے۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ، نبی کریم ﷺ سے عمر میں تین سال چھوٹے تھے، مگر دونوں کے خیالات حیرت انگیز طور پر ملتے تھے اور دونوں کا بچپن بھی ایک ساتھ اور ایک ہی محلے میں گزرا تھا۔ جب بھی آپس میں ملتے تو مشرکانہ رسومات سے بیزاری کا اظہار کرتے اور یہی وہ جذبہ تھا جس کی بناء پر دونوں ذہنی طور پر ہم آہنگ ہو گئے تھے۔ دیکھنے والوں میں دونوں کی دوستی قابلِ رشک تھی۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ جب بھی نبی کریم ﷺ کو دیکھتے تو لپک کر ان کے پاس چلے جاتے، چاہے کیسا ہی اہم کام کیوں نہ کر رہے ہوں اور پھر گھنٹوں ان ہی کے ساتھ رہتے، حالاں کہ یہ باتیں نبی کریم ﷺ کے اعلانِ نبوت سے قبل کی ہیں۔ وہ جتنی دیر بھی وہاں بیٹھتے، باادب اور احترام کے ساتھ بیٹھتے، نہ خود اونچی آواز میں بات کرتے اور نہ ہی ان کے سامنے اونچی جگہ پر بیٹھتے۔ پھر ایک وقت ایسا بھی آیا جب دونوں کا ایک دوسرے کے بغیر رہنا محال ہو گیا۔

ایک روز حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ایک خواب دیکھا کہ چاند ٹکڑے ٹکڑے ہو کر کعبے میں آن گرا ہے۔ پھر مکے کے ہر گھر میں ایک ٹکڑا مزید گرا، اس کے بعد وہ تمام ٹکڑے یکجا ہو کر چمکتا ہوا چاند بن گئے اور انہی کے گھر میں آ گئے۔

بڑا عجیب خواب تھا۔ ایک راہب نے اس کی تعبیر یہ بتائی کہ تمہارے درمیان ایک پیغمبر ہو گا جس کا نورِ ہدایت گھر گھر پہنچے گا اور تم اس کے وزیر ہو گے۔

بچپن میں ایک واقعہ ایسا ہوا جس نے باپ کو حیران و پریشان کر دیا۔ عثمان ابوقحافہ کے گھر پیدا ہونے والا یہ بچہ جس کا نام باپ نے عبداللہ اور ماں نے عبدالکعبہ رکھا تھا، باپ کے ساتھ ایک دن کعبہ جاتے ہوئے ہاتھ میں پتھر اُٹھا لیا۔

باپ نے پوچھا: ''یہ کیوں ساتھ لیا ہے...... اسے پھینک دو؟''

عبداللہ نے کہا: ''کیوں پھینک دوں؟''

''اس لیے کہ کعبے میں پتھر نہیں لے جاتے۔'' باپ نے کہا۔

''تو پھر وہاں پتھر کے بت کیوں رکھے ہیں؟'' بچے نے فوراً جواب دیا اور باپ لاجواب ہو گیا۔

جب کعبے میں داخل ہوئے تو باپ نے ایک جگہ بتوں کے سامنے کھڑے ہو کر بیٹے سے کہا: ''عبداللہ! یہ ہمارے خدا ہیں۔''

عبداللہ نے حیرت سے کہا: ''ابا جان! کیا خدا ایسا ہوتا ہے، میرا دل نہیں مانتا۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پتھر کو ایک بت پر دے مارا جس سے بت ٹوٹ کر زمین پر آ گرا۔ عبداللہ تو وہاں سے بھاگ گیا، مگر باپ کے لیے اس کی یہ حرکت کسی اچنبھے سے کم نہ تھی۔ باپ وہاں کافی دیر تک حیرانی و پریشانی کے عالم میں کھڑا رہا۔

روایت میں ہے کہ جب عبداللہ پیدا ہوا تو ان کی والدہ سلمیٰ بنتِ صخر کو آواز سنائی دی کہ تجھے خوش خبری ہو کہ اس بچے کا نام آسمان پر صدیق لکھا ہوا ہے جو محمد ﷺ کا یار و مددگار ہو گا۔

جب نبی کریم ﷺ نے نبوت کا اعلان کیا تو اس وقت حضرت ابوبکر صدیقؓ اپنے تجارتی کاروان کے ساتھ یمن گئے ہوئے تھے۔ وہاں ایک شیخ سے ملاقات ہوئی۔ اس نے آپؓ کا نام ونسب دریافت کیا، پھر آپ کو غور سے دیکھتے ہوئے کہنے لگا: ''حرم کی سرزمین پر ایک نبی کا ظہور ہونے والا ہے جس کے دو مددگار ہوں گے، ایک جوان اور ایک ادھیڑ عمر، جس کی بابت آسمانوں میں خبر دی گئی ہے۔ تم نبی آخر الزمان کے معاون و مددگار ہو گے۔''
(جوان سے مراد ان کا اشارہ حضرت عمر فاروقؓ کی جانب ہوگا۔)

یمن سے لوٹے تو نبی کریم ﷺ سے ملاقات ہوئی۔ آپؐ نے دعوتِ ایمان دی تو انہوں نے ایک لمحے کی تاخیر کیے بغیر ہی اسلام قبول کر لیا۔ خود نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ میں نے جسے بھی اسلام کی دعوت دی، اس نے انکار کیا یا تاویل پیش کی مگر ابن قحافہ نے کسی توقف کے بغیر ہی لبیک کہا۔

جب نبی کریم ﷺ نے دعوتِ حق دینا شروع کیا تو مکے کے کافروں نے ان پر طرح طرح کے ظلم ڈھائے۔ اس ظلم کا شکار صرف نبی کریم ﷺ ہی نہیں ہوئے بلکہ وہ لوگ بھی ہوئے جنہوں نے نبی کریم ﷺ کی آواز پر لبیک کہا۔ ان میں وہ مسلمان جو کافروں کے غلام تھے، انہیں بدترین تشدد اور اذیت ناک سزائیں دی گئیں۔ ان میں حضرت بلالؓ اور حضرت عمارؓ کے نام قابل ذکر ہیں۔

ایسے حالات میں نبی کریم ﷺ کی اجازت سے پندرہ مرد اور عورتوں نے حبشہ کی جانب پہلی ہجرت کی۔ حضرت ابوبکرؓ بھی ہجرت کا ارادہ رکھتے تھے۔ اس وقت ان کی ملاقات مکے کے رئیس ابن دغنہ سے ہوئی تو وہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کو اپنے لوگوں کے پاس لے آیا اور کہنے لگا کہ یہ ایک محبت کرنے والا ہے جو اپنا روپیہ محتاجوں میں تقسیم کرتا ہے، صلۂ رحمی سے کام لیتا ہے، مسلمانوں کی میزبانی کرتا ہے اور مصائب میں گھرے لوگوں کی بھی مدد کرتا ہے، ایسے شخص کا یہاں سے چلے جانا ہمارا نقصان ہوگا۔ ابن دغنہ نے انہیں اپنی پناہ دینے کا اعلان کیا مگر کفار کی شرط یہ تھی کہ وہ گھر میں چھپ کر عبادت کریں۔ حضرت ابوبکرؓ سے یہ نہ ہو سکا۔

اسی دوران معراج نبویؐ کا واقعہ ہوا، اس میں نبی کریم ﷺ نے رات کے ایک مختصر سے وقت میں مسجد اقصیٰ میں انبیائے کرامؑ کی امامت کی۔ ساتوں آسمانوں کی سیر کی اور سدرۃ المنتہیٰ سے آگے خالقِ کائنات سے ہم کلامی کا شرف حاصل ہوا۔ نبی کریم ﷺ کی اسی معراج کی تصدیق پر حضرت ابوبکرؓ کو صدیق کا لقب عطا ہوا۔

پھر ایک روز خود نبی کریم ﷺ نے ان کے گھر آ کر یہ خوش خبری سنائی کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے ہجرت کا حکم دیا ہے اور اس ہجرت میں مجھے تمہاری رفاقت حاصل ہو گی۔ یہ سن کر حضرت ابوبکر صدیقؓ کے آنسو نکل آئے۔ یہ کیفیت دیکھتے ہوئے نبی کریم ﷺ نے دوبارہ فرمایا: ''ابوبکر حوضِ کوثر پر بھی تم میرے ساتھی ہو گے اور غار میں رفیق ہو گے۔'' اس خوش خبری کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ نے سامانِ سفر تیار کیا اور پھر نبی کریم ﷺ کے ہمراہ دو اونٹنیوں پر سوار ہو کر غارِ ثور کی جانب چلے جو مکے کے جنوب میں چھ میل کے فاصلے پر ہے۔ اس غار تک پہنچنے کا راستہ دشوار اور پتھریلا ہے۔ اللہ کے رسولؐ نے یہاں پر تین دن اور تین راتیں گزاریں۔

جب حضرت ابوبکر صدیقؓ غار کی صفائی کر چکے تو نبی کریم ﷺ داخل ہوئے اور ان کے زانو پر سر رکھ کر سو گئے۔ اسی دوران ایک خالی رہ جانے والی سوراخ پر حضرت ابوبکر صدیقؓ نے پاؤں رکھ دیا تھا، وہاں موجود سانپ نے ڈس لیا۔ درد کی شدت سے نکلنے والے آنسو چہرہ مبارک پر پڑے تو آنکھ کھل گئی۔ پوچھا: ''ابوبکر کیا ہوا؟'' ماجرا بیان فرمایا تو نبی کریم ﷺ نے اپنا لعاب دہن وہاں لگایا جس سے زہر کا اثر جاتا رہا۔

خلیفہ منتخب ہونے کے بعد جو پہلا خطبہ دیا اس میں فرمایا:
''اے لوگو مجھے حکومت میں کچھ راحت نہیں، بلکہ مجھے ایک امرِ عظیم کی تکلیف دی گئی ہے جسے برداشت کرنے کی مجھ میں طاقت نہیں اور نہ اللہ کی مدد کے بغیر وہ قابو میں آ سکتی ہے۔ میں تمہارا حاکم بنایا گیا ہوں، حالاں کہ میں تم سے بہتر نہیں ہوں۔ اگر میں سیدھے راستے پر چلوں تو میری مدد کرنا اور اگر راستے سے ہٹ جاؤں تو مجھے ٹوک دینا۔ جان لو کہ سچائی امانت ہے اور جھوٹ خیانت ہے۔ جو قوم راہِ حق میں جہاد ترک کر دیتی ہے، اللہ اس پر ذلت اور خواری مسلط کر دیتا ہے اور اگر کسی قوم میں بے حیائی پھیل جائے تو اللہ تعالیٰ اس پر عذاب نازل کرتا ہے۔''

نبی کریم ﷺ کے وصال کے بعد مختلف علاقوں سے سازشوں نے سر اُبھارا اور امن و امان کا مسئلہ پیدا ہو گیا، مگر ایسے وقت میں بھی انہوں نے زکوٰۃ سے انکار کرنے والوں کے خلاف جہاد کیا۔ قرآنِ مجید کو کتابی شکل میں جمع کرنا ان کے دور کا اہم کام ہے۔ یہ واحد صحابی ہیں جن کی چار نسلیں صحابی ہوئیں...... یعنی ان کے والد، وہ خود، ان کی اولاد اور اولاد کی اولاد۔ اللہ ان سے راضی ہو۔

☆☆☆

زیادتی

چھٹی کا دن جہاں کچھ لوگوں کے لیے خوشی اور راحت کا سامان لے کر آتا ہے، وہاں کچھ لوگوں کے لیے یہ دن مصیبت کا باعث بھی بن جاتا ہے۔ وارث ان لوگوں میں سے ایک تھا جو روزانہ کنواں کھودتے ہیں اور پانی پیتے ہیں۔ اور آج...... آج کا دن اس کے لیے اور اس کے گھر والوں کے لیے اچھا نہیں تھا۔ اس کی امی صبح سے اس کے کام پر جانے کے لیے کہہ رہی تھی لیکن ہر ہفتے چھٹی والے دن روزی کی تلاش میں مایوسی اور ناکامی کے تجربے کی وجہ سے اس کی ہمت ٹوٹ جاتی تھی۔ وہ اس بات کا منتظر تھا جو اس کی امی ہر ہفتے اصرار کر کے تھک جانے کے بعد اس سے کہتی تھی اور پھر امی نے انتہائی رنجیدہ لہجے میں وہ بات کہہ ڈالی۔

"وارث بیٹا! کچھ کما کر لاؤ گے تو گھر میں کھانا بنے گا ورنہ سب کو بھوکے پیٹ سونا پڑے گا۔" وارث تڑپ کر سیدھا ہو گیا۔ امی مسکرائی اور وارث صحن کی طرف بڑھا۔ یہاں اس کا رکشہ کھڑا تھا۔ اس نے رکشہ اسٹارٹ کیا اور اڈے کی طرف چل پڑا۔ وارث کا گاؤں شہر سے تقریباً دس کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ عام دنوں میں تمام رکشہ والوں کو اچھی خاصی سواریاں مل جاتی تھیں۔ گاؤں کے بہت سے بچے شہر کے اچھے اسکولوں میں تعلیم حاصل کرنے جاتے تھے۔ ملازمت پیشہ افراد بھی اپنے اپنے دفاتر جاتے تھے۔ لوگوں کی ایک بڑی تعداد شہر میں خرید و فروخت کے لیے جاتی تھی۔ اب یہ سیدھی سی بات ہے کہ جو جاتا ہے اسے واپس بھی لوٹنا ہوتا ہے۔ یوں تمام رکشہ ڈرائیورں کی روزی کا انتظام ہو جاتا تھا لیکن چھٹی والے دن تمام نظام معطل ہو کر رہ جاتا تھا۔

اپنی امی کے اصرار پر وارث اڈے میں تو آ گیا تھا لیکن اسے سواری ملنے کی اُمید کم ہی تھی۔ اس سے پہلے چھ رکشہ والے اپنی اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔ اگر سواریاں آتی تو وارث کا نمبر ساتواں ہوتا۔ رکشہ والوں کا یہ اڈا چوراہے پر واقع تھا۔ ایک سڑک شہر کی طرف جاتی تھی اور تین راستے گاؤں سے نکلتے تھے۔ وارث نے اپنا نمبر لگوایا اور گاؤں کی طرف جانے والے ایک راستے پر رکشہ دوڑا دیا۔ یہ ترکیب بہت سے رکشہ والے آزماتے تھے۔ سواریوں کو راستے میں ہی اُٹھا لینا ان کا انتظار کرنے سے بہتر تھا لیکن اب سفر کرنے والے بھی سمجھ دار ہو چکے تھے۔ وہ اڈے میں آ کر جس رکشے کا نمبر پہلا ہوتا اس پر سوار ہونا پسند کرتے تھے۔ وارث کو کسی ایسی سواری کی تلاش تھی جسے شہر جانے کی جلدی ہو اور وہ سواریوں کے ساتھ جانے کی بجائے اکیلے ہی شہر جانا چاہتا ہو۔ وہ گاؤں کے آخری کونے پر پہنچا تو اس کی آنکھوں میں اُمید کی چمک عود کر آئی۔ اس نے ایک مرد اور ایک عورت کو دیکھا تھا۔ ان کے چلنے کا انداز بتا

رہا تھا کہ وہ مسافر ہیں۔ مسافر کے ہاتھ میں ایک سفری بیگ بھی تھا۔ وارث آن کی آن میں ان کے سر پر پہنچ چکا تھا۔

''صاحب، چلیں گے کیا.....؟'' وارث کا لہجہ احترام بھرا تھا۔

''شہر جانا تو ہے لیکن سواریوں کے ساتھ..... اس لیے ہم پہلے اڈے پر جائیں گے۔'' وہ آدمی مسکرایا۔

''میں وہیں سے آ رہا ہوں، وہاں کوئی سواری موجود نہیں ہے۔ آپ لوگ بے کار میں اتنا پیدل چلیں گے۔ بیٹھ جائیں، میں لے چلتا ہوں۔'' وہ دونوں رکشہ میں بیٹھ گئے۔ وارث بہت خوش تھا۔ اللہ نے اس کی روزی کا چھوٹا سا انتظام کیا تھا۔ آج کے دن کے لیے اتنا ہی بہت تھا۔

''آپ گاؤں میں خیر سے آئے تھے۔'' وارث نے پوچھا۔

''ہاں! ہمارے ایک عزیز کی طبیعت خراب تھی۔'' اب وارث نے غور کیا۔ وہ نیا شادی شدہ جوڑا تھا۔ آدمی کے ہاتھ میں سونے کی انگوٹھی تھی جب کہ عورت نے بھی زیورات پہن رکھے تھے۔ اتنی دیر میں اڈا آ گیا۔ جس رکشہ والے کا پہلا نمبر تھا، اس میں بھی دو سواریاں آ بیٹھی تھیں۔ وہ لمحہ امتحان کا تھا۔ وہ رکشہ والا وارث کی سواریوں سے کہہ رہا تھا:

''آیئے صاحب! میرا نمبر پہلا ہے، ہم شہر کو چلتے ہیں۔'' ایک سواری کا کرایہ بیس روپے تھا۔ اگر پرائیویٹ جایا جائے تو رکشہ والے کے ایک سو بیس روپے بنتے تھے۔ اب یا تو وارث چالیس روپے کماتا یا پھر ان دو سواریوں سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتا۔ ایک ہلکی سی اُمید یہ بھی تھی کہ شاید راستے میں وارث کو کوئی اور سواری مل جائے۔ وہ سوچ رہا تھا اور اس کے رکشے میں موجود سواریوں کا دل بھی اندر باہر ہو رہا تھا کہ وارث نے فیصلہ کر لیا۔

''صاحب، ہم چلتے ہیں۔ میں آپ کو چالیس روپے میں ہی شہر لیے چلتا ہوں۔'' اتنا کہہ کر وارث نے رکشہ دوڑا دیا۔ اڈے میں موجود رکشہ والا ہاتھ ملتا رہ گیا۔ گاؤں سے نکلتے ہی ویرانہ شروع ہو گیا۔ کہیں بنجر کھیت تھے تو کہیں فصلیں لہلہا رہی تھیں۔ سورج سر پر پہنچ چکا تھا۔ گرمی اپنے عروج پر تھی۔ شاید اسی وجہ سے کوئی انسان کوئی جانور کوئی پرندہ دُور دُور تک نظر نہیں آ رہا تھا۔ وارث خاموشی سے رکشہ کی ڈرائیونگ کر رہا تھا اور اس کے پیچھے رکشہ میں موجود دونوں میاں بیوی باتوں میں مصروف تھے۔ ایسے میں وارث کو کچھ یاد آ گیا۔ ایک لمحے کے لیے اس کا توازن خراب ہوا لیکن پھر اس نے خود پر قابو پا لیا۔ اسے تنویر یاد آ گیا تھا۔ ابھی کل کی بات ہے، تنویر شہر میں موجود رکشوں کے اڈے پر آیا تھا۔ وارث نے اسے تین دن کے بعد دیکھا تھا اور جب دیکھا تھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ یہ وہ تنویر تو نہیں تھا جو رکشہ چلاتا تھا۔ اس نے اچھا لباس پہنا ہوا تھا۔ ہاتھ میں موبائل بھی قیمتی تھا۔ اس کا تو انداز ہی بدلا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر سب ہی حیران ہو رہے تھے۔ تنویر وارث کا بچپن کا دوست تھا۔ ان دونوں کو ایک دوسرے پر اعتماد تھا، بھروسا تھا۔ وہ دل کی بات ایک دوسرے سے کہہ لیا کرتے تھے اور آج بھی وارث کو پورا یقین تھا کہ تنویر اور کسی کو بتائے یا نہ بتائے لیکن وارث کو ضرور بتائے گا کہ اس کے انداز اور اطوار میں تبدیلی کی وجہ کیا ہے اور پھر تنویر نے وارث کو ساری بات بتائی۔ یہ بات ایسی تھی کہ وارث کانپ کر رہ گیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تنویر ایسی حرکت بھی کر سکتا ہے۔

تین دن پہلے تنویر کے رکشہ میں ایک مسافر بیٹھا تھا۔ رات کا وقت تھا۔ اپنی شکل وصورت اور لباس سے وہ ایک امیر آدمی معلوم ہوتا تھا۔ تنویر کا دل بے ایمان ہو گیا۔ اس کا کام ایسا تھا کہ ہر مزاج کے لوگوں سے اس کا ملنا ملانا رہتا تھا۔ چند بدمعاش دوستوں کی صحبت نے اس پر اپنا رنگ چڑھا دیا تھا اور پھر اس نے اس رنگ کا اثر لیا۔ اس کے پاس ایک چھوٹا سا خنجر تھا۔ ایک تاریک مقام پر اس نے اپنا رکشہ روک لیا اور پھر خنجر کی نوک پر اس مسافر کو لوٹ لیا۔ اس واردات میں ایک قیمتی موبائل اور تیس ہزار کے قریب رقم اس کے ہاتھ لگی۔ اس مسافر کو ایک گہرا زخم لگا کر وہ اپنے رکشے کے ہمراہ فرار ہونے میں کام یاب ہو گیا۔ اب اس لوٹ کی رقم سے وہ عیش کر رہا تھا۔ جانے کیوں وارث کو تنویر کا خیال آ گیا تھا اور اب شیطانی جذبہ وارث کو ورغلانے لگا تھا۔ اس کے رکشے میں نوبیاہتا جوڑا بیٹھا ہوا تھا۔ ان کے پاس زیورات تھے۔ نقد رقم بھی ضرور موجود ہو گی۔ وارث کے پاس ایک نوکیلا پیچ کس موجود تھا جس کی مدد سے وہ ضرورت پڑنے پر اپنے رکشہ کی مرمت کرتا تھا۔ اس پیچ کس سے وہ ہتھیار کا کام لے سکتا تھا۔ دُور دُور تک ویرانہ تھا۔ اک ذرا سا حوصلہ چاہیے تھا اور پھر اس کے گھر کے تمام افراد خوش حال ہو جاتے۔

وہ دل ہی دل میں منصوبہ بنانے لگا۔ وہ رکشہ کی خرابی کا بہانہ کر کے رُک جائے گا اور پھر نوکیلا پیچ کس عورت کی شہ رگ پر رکھ کر
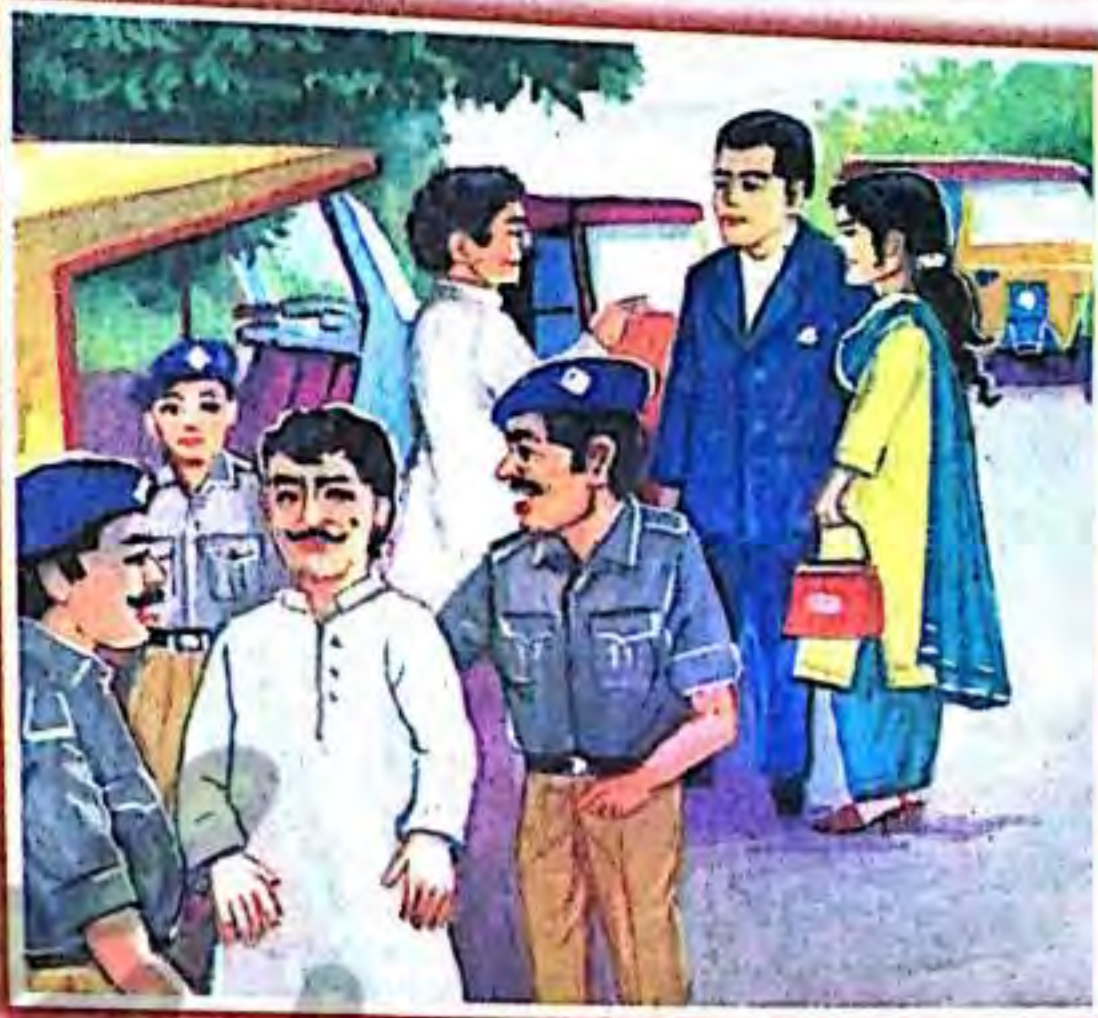
ان سے تمام زیورات اور نقدی چھین لے گا اور پھر...... اور پھر......"

ایسے میں اچانک جیسے ایک روشنی کی لہر کوندی ہو۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اس کی امی کا چہرہ آ گیا۔ امی کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس کا بیٹا غریب ہو سکتا تھا لیکن راہزن نہیں ہو سکتا تھا۔ تمام شیطانی جذبات ایک لمحے میں فنا ہو کر رہ گئے تھے۔ اب وارث مطمئن تھا۔ اس کے رکشے میں موجود سواریاں لاعلم تھیں کہ ایک خوف ناک طوفان ان کی زندگیوں میں آتے آتے ٹل گیا ہے۔

اب شہر کے آثار شروع ہو گئے تھے۔ یہ وارث کی بدقسمتی تھی کہ راستے میں اسے ایک بھی سواری نہیں ملی تھی۔ پھر اس کا رکشہ شہر میں موجود رکشوں کے اڈے پر پہنچ گیا۔

یہاں وارث نے ہلچل کے آثار دیکھے ایک جگہ لوگوں کا ہجوم جمع تھا۔ لوگ بھاگ دوڑ رہے تھے۔ اکثر کی زبان پر یہ جملہ موجود تھا۔

"کیا ہوا...... کیا ہوا......؟" وارث کے ذہن میں بھی یہ سوال ناچنے لگا تھا۔

"تنویر پکڑا گیا۔" وارث نے ایک شور سا سنا۔ اس خبر نے وارث کو بے چین کر دیا اور پھر وارث نے تنویر کو دیکھا۔ اس کے چاروں طرف پولیس کی نفری موجود تھی۔ پولیس نے اسے یوں دبوچ رکھا جیسے بکرے کو ذبح کرنے سے پہلے قصائی دبوچتے ہیں۔ اس کی حالت بہت خراب تھی۔ وہ رو رہا تھا، معافیاں مانگ رہا تھا۔ آزاد ہونے کی کوشش میں اس کے کپڑے بھی پھٹ چکے تھے۔ وہ جتنا زور لگاتا تھا، پولیس کے جوان اس پر اتنی ہی گرفت بڑھا دیتے تھے۔ پھر وارث نے سنا، کوئی کہہ رہا تھا:

"کیا زمانہ آ گیا ہے۔ منزل پر پہنچانے والے راستے میں لوٹنے لگے ہیں۔ اس نوجوان نے ایک آدمی کو خنجر کی نوک پر لوٹا ہے لیکن یہ نہیں جانتا جرم کوئی بھی ہو اپنے پیچھے سراغ چھوڑ جاتا ہے۔ یہ نوجوان اس آدمی کا موبائل استعمال کرنے لگا تھا۔ چوری کا موبائل چل رہا ہو تو سراغ لگانا آسان ہو جاتا ہے کہ چور اور موبائل دونوں کہاں ہیں۔ اب یہ طویل عرصے کے لیے جیل میں جائے گا ایک تو اس نے ڈاکہ مارا ہے، دوسرے اس نے اس آدمی کو زخمی کیا ہے۔ احمق جرم کرنے سے پہلے ان لوگوں کے متعلق تو سوچ لیتا جو اس سے پیار کرتے ہیں۔ اس کے والدین کے دل پر کیا بیتے گی؟" اس سوالیہ نقطے پر اس آدمی نے بات ختم کر دی تھی۔ وارث کی آنکھوں کے کنارے سلگنے لگے تھے۔ ٹھیک وقت پر اسے اپنی ماں کا خیال آ گیا تھا، ورنہ اس کا متوقع انجام تو وہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔

ایسے میں وہ چونک پڑا۔ وہ اپنے رکشے میں موجود سواریوں کو تو بھول ہی گیا تھا۔ وہ میاں بیوی وارث کے رکشے سے اُتر آئے تھے۔

"بھائی، کرایہ تو لے لو۔" وہ آدمی وارث سے کہہ رہا تھا۔ پھر اس نے اپنی پتلون والی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ پرس نکال کر اس نے کھولا تو وارث نے دیکھا۔ پرس میں ہزار، ہزار والے کتنے ہی نوٹ موجود تھے۔ اس آدمی نے ایک سو روپے والا نوٹ نکال کر وارث کی طرف بڑھایا اور بولا: "رکھ لو......" وارث حیران رہ گیا۔

"کیا مطلب......؟"

"تم ہمیں گاؤں سے شہر تک لائے۔ ہمارے درمیان کرائے کی بات طے ہو چکی تھی لیکن میرا دل نہیں چاہتا کہ میں تمہارے ساتھ زیادتی کروں۔ اس لیے یہ سو روپے تم رکھ لو۔" وارث کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ وہ آدمی بھی مسکرایا اور پھر وہ دونوں میاں بیوی اپنی منزل کی طرف چل پڑے۔ شرمندگی کے احساس سے وارث کا سر جھک گیا۔ وہ اتنے اچھے آدمی کو لوٹنے کا منصوبہ بنا رہا تھا۔ اس ایک لمحے میں وارث نے جان لیا۔

"جو کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کرتا، اللہ بھی اس کے ساتھ زیادتی نہیں ہونے دیتا۔"

☆☆☆

راشد علی نواب شاہی

پیارے اللہ کے پیارے نام

اَلْقَادِرُ جَلَّ جَلَالُہٗ (قدرت والا)

اَلْقَادِرُ جَلَّ جَلَالُہٗ جو چاہتے ہیں اسے پورا کرنے کی طاقت رکھتے ہیں۔ کوئی بھی چیز انہیں کسی کام کو پورا کرنے سے نہیں روک سکتی۔ یہ مبارک نام قرآن کریم میں بارہ جگہ آیا ہے۔ اب دیکھیے آگ جلاتی ہے، مگر وہ قادر ہے کہ آگ میں رکھ کر کسی کو نہ جلائے جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نمرود بادشاہ نے کئی روز تک آگ میں ڈالے رکھا، مگر اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت دکھائی، وہی آگ ابراہیم علیہ السلام کے لیے سلامتی والی ٹھنڈی بن گئی۔

چھری کا کام ہے کاٹنا، لیکن یہ چھری حضرت اسماعیل علیہ السلام کے گلے کو نہ کاٹ سکی۔ دریا جو بہت گہرا ہوتا ہے اس میں کوئی آدمی گر جائے تو پانی میں ڈوب جاتا ہے، مگر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے دریائے نیل میں بارہ راستے بنا دیے اور وہ خیریت سے دریا پار کر گئے اور جب فرعون کا لشکر گزرنے لگا تو اسی دریا میں وہ سب کے سب ہلاک ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ قادر ہیں، جس چیز کا ارادہ کر لیں تو کوئی بھی طاقت اسے روک نہیں سکتی۔

اَلْمُقْتَدِرُ جَلَّ جَلَالُہٗ (بہت زیادہ قدرت والا)

اَلْمُقْتَدِرُ جَلَّ جَلَالُہٗ جب کسی چیز کے بنانے کا ارادہ فرمالیں تو صرف یہ فرماتے ہیں "کُنْ" ہو جا! تو وہ ہو جاتی ہے۔

یہ لفظ تو ہمیں سمجھانے کے لیے ہے ورنہ اللہ تعالیٰ کو اس لفظ کے کہنے کی بھی ضرورت نہیں۔ کائنات کی ساری چیزیں اس کے قبضے میں ہیں۔ وہ ناکامی کے نقشے میں کام یابی دینے والا ہے اور کام یابی کے نقشے میں ناکامی دینے والا ہے۔

اونٹنی

ماریہ اور علی کے امتحان مکمل ہو چکے تھے تو تفریح کے لیے آج ابو انہیں ساحل سمندر لائے ہوئے تھے۔

"جی صاحب! سواری کرو گے؟"

"ابو! مجھے تو بیٹھنا ہے۔" ماریہ کہنے لگی۔

"نہیں ابو! مجھے نہیں بیٹھنا ہے۔" علی کہنے لگا۔

"ابو! مجھے تو اونٹ سے ڈر لگتا ہے۔ اس لیے مجھے اچھے نہیں لگتے۔" علی نے کہا۔

"نہیں بیٹا! ڈرتے نہیں ہیں۔"

ابو دونوں کو ساتھ لے کر اونٹ پر سوار ہو گئے۔ شروع میں علی خوف محسوس کر رہا تھا لیکن پھر تھوڑی دیر بعد مطمئن ہو گیا۔ اسے مطمئن دیکھ کر ابو نے کہا: "معلوم ہے اونٹ کن کی سواری تھی؟"

"جی ابو! ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی۔" ماریہ کہنے لگی۔

"شاباش! اس لیے اونٹ کو محبت کی نگاہ سے دیکھنا چاہیے کہ یہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سواری ہے۔"

اونٹ کی سواری کے بعد گھر سے لائی ہوئی کھانے پینے کی چیزوں کو لے کر ایک بینچ پر بیٹھ گئے۔

"ابو! کتنا بڑا سمندر ہے۔" ماریہ حیرت سے کہنے لگی۔

"ابو! یہ سب اللہ کی قدرت ہے کہ کتنا بڑا سمندر بنایا۔" علی نے بھی سمجھ داری کی بات کی۔

بیٹا! آپ کو اللہ تعالیٰ کی قدرت کا ایک واقعہ سناؤں کہ اللہ تعالیٰ کیسی قدرت والے ہیں۔ دونوں بچے تفریح کے ماحول میں بڑے شوق سے سننے لگے۔

حضرت صالح علیہ السلام نے اپنی جوانی ہی کے زمانے سے اپنی قوم کو اللہ کے ایک ہونے کی دعوت دینا شروع کی۔ ان کی قوم نے یہ سوچا کہ ان سے کوئی ایسا مطالبہ کرو جس کو یہ پورا نہ کرسکیں اور ہم ان کی مخالفت میں کامیاب ہو جائیں۔ مطالبہ یہ کیا کہ اگر آپ واقعی اللہ کے رسول ہیں تو ہماری فلاں پہاڑی جس کا نام "تبہ" تھا اس کے اندر سے ایک ایسی اونٹنی نکال دیجیے جو قوی و تندرست ہو۔ صالح علیہ السلام نے اوّل ان سے عہد لیا کہ اگر میں تمہارا یہ مطالبہ پورا کردوں تو تم سب میری دعوت پر ایمان لے آؤ گے۔ جب سب نے معاہدہ کرلیا تو صالح علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی۔ دعا کرتے ہی پہاڑی کے اندر حرکت پیدا ہوئی اور اس کی ایک بڑی چٹان پھٹ کر اس میں سے ایک اونٹنی اسی طرح کی نکل آئی جیسا مطالبہ کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کی واضح قدرت اپنی آنکھوں سے دیکھ کر ان میں سے کچھ لوگ تو مسلمان ہوگئے اور باقی قوم نے بھی ارادہ کرلیا کہ وہ ایمان لے آئیں مگر قوم کے چند سردار جو بتوں کے پجاری تھے، انہوں نے ان کو بہکا کر اسلام قبول کرنے سے روک دیا۔ حضرت صالح علیہ السلام نے جب دیکھا کہ قوم نے وعدہ خلافی کی اور خطرہ ہوا کہ ان پر کوئی عذاب آ جائے گا تو نرمی سے ان کو یہ نصیحت فرمائی کہ "اس اونٹنی کی حفاظت کرو، اس کو کوئی تکلیف نہ پہنچاؤ تو شاید تم عذاب سے محفوظ رہو ورنہ فوراً تم پر عذاب آ جائے گا، اس اونٹنی کو چھوڑ دو کہ اللہ کی زمین میں چر لیا کرے۔ اگر اس اونٹنی کو نقصان پہنچایا تو اللہ تعالیٰ دردناک عذاب دیں گے۔

"ابو! اس اونٹنی کا کیا نام تھا؟" ماریہ نے معصومانہ انداز میں سوال کیا۔

"بیٹی! اس کا نام 'ناقۃ اللہ' یعنی اللہ تعالیٰ کی اونٹنی تھا۔"

حضرت صالح علیہ السلام نے ان کو سمجھایا کہ اس ناقہ کے کھانے پینے میں تمہارا کچھ نہیں جاتا، زمین اللہ کی ہے، اس کی پیداوار کا پیدا کرنے والا وہی ہے، اس اونٹنی کو اس کی زمین میں آزاد چھوڑ دو کہ عام چراگاہوں میں کھاتی رہے۔ قوم ثمود جس کنوئیں سے پانی پیتے تھے اسی سے یہ اونٹنی بھی پانی پیتی تھی مگر یہ اونٹنی جب پانی پیتی تو پورے کنوئیں کا پانی ختم کردیتی تھی۔ حضرت صالح علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی اجازت سے یہ فیصلہ فرما دیا تھا کہ ایک دن یہ اونٹنی پانی پیے گی اور دوسرے دن قوم کے سب لوگ پانی لیں گے اور جس روز یہ اونٹنی پانی پیے گی تو دوسروں کو پانی کے بجائے اونٹنی کا دودھ اس مقدار میں مل جاتا کہ وہ اپنے سارے برتن دودھ سے بھر لیتے تھے لیکن قوم کے ایک سردار نے اس اونٹنی کو قتل کردیا۔ حضرت صالح علیہ السلام نے اونٹنی کے قتل کا واقعہ معلوم ہونے کے بعد قوم کو اللہ تعالیٰ کے حکم سے بتلا دیا کہ اب تمہاری زندگی کے صرف تین دن باقی ہیں اور یہ وعدہ سچا ہے۔ انہوں نے اس بات کی طرف کوئی توجہ نہ دی بلکہ حضرت صالح علیہ السلام کی اس بات پر بھی ان بدبختوں نے مذاق اُڑانا شروع کیا اور کہنے لگے کہ یہ عذاب کیسے اور کہاں سے آئے گا؟ اور اس کی علامت کیا ہوگی؟

حضرت صالح علیہ السلام نے فرمایا: "لو عذاب کی علامات بھی سن لو، کل جمعرات کے روز تم سب کے چہرے بہت زرد ہو جائیں گے، پھر پرسوں جمعہ کے روز سب کے چہرے بہت سرخ ہو جائیں گے اور ترسوں ہفتہ کو سب کے چہرے شدید سیاہ ہو جائیں گے اور یہ دن تمہاری زندگی کا آخری دن ہوگا۔"

بدنصیب قوم نے یہ سن کر بھی بجائے اس کے کہ توبہ کرتے بل کہ یہ فیصلہ کرلیا کہ صالح علیہ السلام ہی کو قتل کردیا جائے کیوں کہ اگر یہ سچے ہیں اور ہم پر عذاب آنا ہی ہے تو ہم اپنے سے پہلے ان کا کام تمام کیوں نہ کردیں اور اگر جھوٹے ہیں تو اپنے جھوٹ کا خمیازہ بھگتیں۔

قوم کے اس فیصلہ کے بعد کچھ لوگ رات کو حضرت صالح علیہ السلام کے مکان پر قتل کے ارادہ سے گئے، مگر اللہ تعالیٰ نے راستہ ہی سے پتھر برسا کر ہلاک کردیا اور جب جمعرات کی صبح ہوئی تو حضرت صالح علیہ السلام کے کہنے کے مطابق سب کے چہرے ایسے زرد ہو گئے جیسے گہرا زرد رنگ پھیر دیا گیا ہو۔ عذاب کی پہلی علامت کے سچا ہونے کے بعد بھی ظالموں کو اس طرف کوئی توجہ نہ ہوئی کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتے اور اپنی غلط کاریوں سے باز آ جاتے بل کہ ان کا غصہ حضرت صالح علیہ السلام پر اور بڑھ گیا اور پوری قوم ان کے قتل کی فکر میں پھرنے لگی۔ بالآخر دوسرا دن آیا تو اللہ تعالیٰ کے پیغمبر، حضرت صالح علیہ السلام کے فرمان کے مطابق سب کے چہرے سرخ ہو گئے اور تیسرے دن سخت سیاہ ہو گئے۔ اب تو یہ سب کے سب اپنی زندگی سے مایوس ہو کر انتظار کرنے لگے کہ عذاب کس طرف سے کس طرح آتا ہے۔ اسی حال میں زمین سے شدید زلزلہ آیا اور اوپر سے سخت ہیبت ناک چیخ اور شدید آواز آئی جس سے سب کے سب ایک وقت میں بیٹھے بیٹھے اوندھے گر کر مر گئے۔

☆☆☆

میں ایک امیر آدمی ہوں۔ میرا ریڈی میڈ گارمنٹس کا کاروبار ملک کے مختلف شہروں میں پھیلا ہوا ہے۔ کار، کوٹھی بہت سارا بنک بیلنس، بے شمار ملازم، گھر میں بیوی بچے غرض کہ ہر طرح کی آسائش مجھے حاصل ہے۔ دولت و کاروبار مجھے اپنے باپ دادا کی طرف سے ورثے میں ملا ہے۔ اس کا میں اکیلا وارث ہوں کیوں کہ میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہوں۔ میرا کاروبار دن دگنی رات چوگنی ترقی کر رہا ہے۔ دن بدن میری دولت میں اضافہ ہو رہا ہے اور میرے خیال میں کون نہیں چاہے گا کہ اس کے پاس ڈھیروں روپیہ پیسہ نہ ہو۔ میں بھی دولت سے محبت کرتا ہوں اور دن رات اسے مزید حاصل کرنے کے چکر میں رہتا ہوں۔ میرے بیوی بچوں کو ہمیشہ مجھ سے یہ گلہ رہا ہے کہ میں ان کو زیادہ وقت نہیں دے پاتا۔ میرے نزدیک دولت ہی سب کچھ ہے، سارا وقت اس کو سمیٹنے میں لگا دینا چاہیے۔ میں دولت سے جتنی محبت کرتا ہوں غربت سے اتنی ہی نفرت کرتا ہوں۔ غریب لوگ مجھے ذرا بھی پسند نہیں ہیں۔ میں ان کے ساتھ بُرے سلوک سے پیش آتا ہوں۔ ان کے جذبات و احساسات اور مجبوریوں کی مجھے قطعی کوئی پروا نہیں ہوتی ہے۔ گھر اور دفتر میں چھوٹے درجے کے ملازم جو عموماً غریب ہوتے ہیں، میری ڈانٹ ڈپٹ اور ناروا برتاؤ کا زیادہ شکار ہوتے ہیں۔ میرے اس طرزِ عمل کی وجہ سے ان میں سے اکثر نوکری بھی چھوڑ جاتے ہیں جیسا کہ میرے دفتر میں غریب آفس بوائے پچھلے دنوں نوکری چھوڑ گیا تھا۔ غلطی تو اس کی ذرا سی تھی مگر ایک غریب سے سرزد ہوئی تھی اور غریبوں سے تو گویا میری سدا کی دشمنی تھی۔ ہوا کچھ یوں کہ اس دن میں صبح دس بجے آفس آیا تو حسبِ معمول آفس بوائے سے کہا کہ میرے لیے چائے بنا دو۔ وہ چائے بنا لایا اور جیسے ہی میری میز پر رکھنے لگا تو اچانک چائے کا کپ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ گرما گرم چائے میری میز پر گر گئی۔ میز پر ضروری کاغذات پڑے تھے، وہ خراب ہو گئے۔ یہ دیکھ کر میں طیش میں آ گیا اور اس کو زور سے تھپڑ رسید کرتے ہوئے تیز لہجے میں کہا: ”آنکھیں نہیں ہیں تمہاری، دیکھ کر کام نہیں کرتے؟ سارے کاغذات برباد کر دیئے ہیں۔“ وہ سوری سر، سوری سر کی گردان کرنے لگا۔ ”دفع ہو جا میری نظروں کے سامنے سے۔“ میرے یوں ڈانٹنے سے وہ حواس باختہ ہو گیا تھا۔ وہ وہاں سے جانے لگا تو میں نے پھر تیز لہجے میں کہا: ”پہلے میز صاف کرو پھر دفع ہونا۔“ وہ میرے حکم کی تعمیل کرنے لگا۔ میں اپنی جگہ سے اُٹھ کر ٹہلتے ٹہلتے میز کے کنارے تک آیا اور جو کاغذات خراب ہو گئے تھے، ان کا جائزہ لینے لگا۔ وہ اصل کاغذات نہیں تھے بلکہ فوٹو کاپی تھے جو اگر خراب ہو بھی گئے تھے تو کوئی بات نہیں تھی۔ اصل کاغذات سے ان کی مزید فوٹو کاپیاں بن سکتی تھیں مگر

ان کا ایک غریب کے ہاتھوں خراب ہونا میرے نزدیک اس کی ایک سنگین نوعیت کی غلطی تھی جو میں معاف نہیں کر سکتا تھا۔ پھر اس دن میں جتنی دیر آفس میں رہا، آفس بوائے کو ڈانٹتا ہی رہا۔ وہ مجھ سے خوف زدہ رہا اور شاید اتنا دلبرداشتہ ہو گیا تھا کہ دوسرے دن سے وہ آفس ہی نہیں آیا۔ میرے بُرے سلوک کی وجہ سے نہ صرف وہ بلکہ ان ہی دنوں میرے گھر کا ایک پانچ سالہ پُرانا ملازم بھی نوکری چھوڑ گیا تھا مگر مجھے کوئی افسوس نہیں تھا۔ میرے پاس دولت کی فراوانی تھی۔ ایک ملازم کی جگہ میں دس ملازم رکھ سکتا تھا۔ گھر اور دفتر سے باہر بھی غریب لوگوں سے میرا واسطہ پڑتا رہتا تھا۔ میرے نزدیک وہ میرے بُرے سلوک کے مستحق تھے۔ یہ سب کچھ میری بیوی کی نظروں سے چھپا ہوا نہیں تھا۔ وہ گاہے بگاہے مجھے ٹوکتی رہتی تھی کہ غریبوں کے معاملے میں مَیں اپنے برتاؤ میں بہتری لاؤں، کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی غریب کی بددعا یا کسی مظلوم کے دل کی آہ کا شکار ہو جاؤں یا غریبوں کے ساتھ میری کی گئی بدسلوکیوں کا قدرت مجھ سے حساب لے۔ قدرت کی گرفت سے تو کوئی نہیں بچ سکتا مگر میں دولت کمانے میں اتنا مگن تھا کہ بیوی کی ایسی باتوں کو نظر انداز کر دیتا تھا۔ غریبوں کی کیا مجبوریاں ہوتی ہیں، ان کے کیا مسائل ہوتے ہیں، کیا اپنی دولت سے ان کی مدد کرنی چاہیے؟ میں یہ جاننا اور سمجھنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ دن یوں ہی گزر رہے تھے، میں دولت مند سے دولت مند ہوتا جا رہا تھا۔ کبھی کبھی مجھے اپنی بیوی کی باتیں یاد آ جاتی تھیں لیکن مجھے ابھی تک نہ کسی غریب کی بددعا لگی تھی اور نہ میں قدرت کی طرف سے کسی پکڑ میں آیا تھا بلکہ قدرت مجھے خوب نواز رہی تھی۔ ایک دن میرے ساتھ ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے میری کایا پلٹ دی۔

وہ واقعہ یہ ہے کہ ایک روز اچانک مجھے کاروباری معاملے میں دوسرے شہر جانا پڑا۔ اتفاق سے اس روز میرا ڈرائیور ڈیوٹی پر نہیں تھا۔ وہ کسی دُور دراز گاؤں کا رہائشی تھا۔ ایک دن پہلے اسے اطلاع ملی تھی کہ گاؤں میں اس کی بیوی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ پھر اسی روز وہ گاؤں کے لیے روانہ ہو گیا تھا۔ وہ سرپھرا قسم کا آدمی تھا۔ اس نے مجھ سے چھٹی نہیں مانگی تھی، بس اطلاع دی تھی کہ اس کا گاؤں جانا بہت ضروری ہے۔ وہاں اس کا قیام کتنے دنوں کا ہوتا، کچھ معلوم نہیں تھا۔ اس کے یوں چلے جانے سے مجھے کوفت تو ہوئی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ اسے نوکری سے نکال دوں لیکن پھر میں کسی کاروباری معاملے میں اُلجھ کر اپنی اس سوچ پر عمل نہ کر سکا۔ میں کسی اور ذریعے سے بھی آسانی سے دوسرے شہر جا سکتا تھا مگر اس روز میں نے خود ہی کار ڈرائیو کرنے کا فیصلہ کیا۔ پھر ضروری سامان کار میں رکھوا کر صبح سویرے اکیلے ہی دوسرے شہر کے لیے روانہ ہو گیا۔ وہاں پہنچ کر کاروباری معاملات بڑے اچھے طریقے سے طے ہو گئے۔ ان کاروباری معاملات سے مجھے اچھے منافع کی سو فیصد توقع تھی۔ میں بہت خوش تھا۔ سارے کاموں سے فارغ ہو کر میں نے عمدہ ریستوران میں اچھا کھانا کھایا۔ میری واپسی کا سفر تقریباً سات بجے شروع ہوا۔ تین گھنٹے کی ڈرائیو تھی۔ رات دس بجے تک میں نے اپنے شہر میں پہنچ جانا تھا۔ گرمی کے موسم کا آغاز ہو چکا تھا۔ میں نے کار کا اے سی آن کر دیا اور طویل سڑک پر بڑے خوش گوار موڈ میں کار دوڑائے جا رہا تھا۔ یہ ایک معروف شاہراہ تھی۔ میں تقریباً آدھا گھنٹہ کار چلا چکا تو مجھے رُکنا پڑا۔ آگے ٹریفک جام تھا۔ گاڑیوں کی لمبی قطاریں لگی ہوئی تھیں۔ اندازہ ہوتا تھا کہ یہاں راستہ جلدی نہیں کھلے گا۔ چناں چہ میں نے متبادل راستہ اختیار کرنے کی ٹھانی۔ اس راستے کا مجھے بخوبی علم تھا، میں نے اپنی کار واپس موڑ کر اس راستے پر ڈال دی۔ یہ کوئی معروف سڑک نہیں تھی، راستہ کچا تھا۔ کافی آگے جا کر یہ راستہ اس سڑک سے جا ملتا جو میرے شہر کو جاتی تھی۔ اس سڑک پر ٹریکٹر، ٹرالیاں، گدھا گاڑیاں اور اسی طرح کی دوسری سواریاں کبھی کبھار گزرتی تھیں۔ دائیں بائیں تاحدِ نگاہ تک کھیتوں کے طویل سلسلے تھے۔ شام کو تو ویسے بھی یہ راستہ ویران نظر آ رہا تھا۔ سورج کب کا غروب ہو چکا تھا۔ میں نے اپنی کار کی ہیڈ لائٹس جلا دی تھیں۔ ایک موڑ سے اپنی کار کو موڑا تو آگے درخت کا ایک موٹا سا تنا عین سڑک کے درمیان میں پڑا تھا۔ میں نے فوراً بریک لگا کر کار کو بائیں طرف موڑ دیا لیکن پھر بھی کار رُکتے رُکتے ایک کھیت میں جا گھسی۔ اگر میں فوراً بریک لگا کر کار نہ موڑتا تو اس تنے سے ٹکرا کر یقیناً میری کار اُلٹ جاتی۔ میں اس اچانک افتاد سے گھبرا گیا اور کار سے باہر نکل کر صورتِ حال کا جائزہ لینے لگا تھا کہ عین اسی لمحے چار پانچ نقاب پوش آس پاس کے کھیتوں سے نکل کر آناً فاناً میری کار کے قریب آ گئے۔ ان کے ہاتھوں میں ہتھیار تھے جو انہوں نے مجھ پر تان لیے۔ ان میں سے ایک کرخت لہجے میں بولا: ”جو کچھ تمہارے

پاس مال ہے، فوراً نکال کر ہمیں دے دو ورنہ جان سے جاؤ گے۔''
میں ان نقاب پوشوں کو دیکھ کر پہلے تو خوف زدہ ہو گیا تھا مگر دوسرے ہی لمحے اپنے خوف پر قابو پا کر جرأت سے کہا:

''کون ہو تم لوگ؟ اپنی اس حرکت سے باز آ جاؤ!''

''ہم ڈاکو ہیں، لوگوں کو لوٹنا ہمارا پیشہ ہے۔ جو کچھ کہا ہے اس پر عمل کرو ورنہ کسی کو مارنا ہمارے لیے مشکل نہیں ہے۔'' ایک ڈاکو نے تیز لہجے میں کہتے ہوئے اپنے موزر کا رُخ میرے سر کی جانب کر دیا۔ اس وقت میرے کوٹ کی اندرونی جیب میں چالیس ہزار روپے تھے۔ میں جو دولت کا پجاری تھا، اتنی آسانی سے یہ رقم ان کے حوالے نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے مزاحمت کرنے کا سوچا تو ان میں سے ایک نے اپنے ساتھی سے کہا: ''شیرو مار ڈال اس کو، یہ ایسے ہی ہمیں کچھ نہیں دے گا۔'' میں نے آگے بڑھ کر اس موزر کی طرف پھرتی سے ہاتھ بڑھایا۔ عین اسی لمحے عقب سے کسی نے سخت چیز سے میرے سر کے عقبی حصے پر کاری ضرب لگائی، میری آنکھوں کے سامنے تارے ناچ گئے۔ کچھ دیر بعد ایک اور ضرب لگی۔ میں نڈھال سا ہو گیا۔ ایک ڈاکو نے میرے کوٹ کی جیبوں کی تلاشی لی۔ آخر اسے چالیس ہزار روپے مل گئے۔ ایک ڈاکو نے میری کلائی پر بندھی قیمتی گھڑی جھٹکے سے اُتار لی۔ ڈاکو میری کار کی جانب بڑھ رہے تھے جس میں میرا نہایت بیش قیمت موبائل موجود تھا، وہ بھی انہوں نے اپنے قبضے میں کر لیا۔ میں اب مزاحمت کرنے کی پوزیشن میں بالکل نہیں تھا۔ یوں لگ رہا تھا کہ میں ابھی بے ہوش ہو جاؤں گا۔ سر کے پچھلے حصے میں لگنے والی چوٹیں بڑی تکلیف دے رہی تھیں۔ وہ سب مجھے مکوں اور ٹانگوں سے میرے جسم کے مختلف حصوں پر ضربیں لگا رہے تھے۔ پھر میں ہوش و حواس کھو بیٹھا۔

نجانے میں کتنی دیر بے ہوش رہا۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں نے خود کو ایک چارپائی پر لیٹا ہوا پایا۔ پہلے تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ میں یہاں کیوں ہوں لیکن پھر اچانک مجھے سب کچھ یاد آ گیا۔ میں نے چارپائی سے اُٹھنا چاہا تو میرے سر اور گردن کے پچھلے حصے میں ٹیسیں اُٹھنے لگی تھیں۔ وہاں پٹیاں بھی بندھی ہوئی تھیں۔ سارا جسم پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ بہت کمزوری بھی محسوس ہو رہی تھی۔ میں چارپائی پر دوبارہ لیٹ گیا اور اردگرد کے ماحول کا جائزہ لینے لگا۔ میں جس کمرے میں تھا، اس کی دیواریں مٹی کی تھیں۔ چارپائی پر بچھا بستر اگرچہ معمولی تھا مگر صاف ستھرا تھا۔ اس سے ذرا فاصلے پر لکڑی کی خستہ حال میز اور بیٹھنے کے لیے دو موڑھے تھے۔ میرے دائیں طرف کمرے کی کھڑکی کھلی تھی اور سورج کی روشنی اندر آ رہی تھی۔ نجانے دن کا کون سا پہر تھا۔ میں نے کھڑکی کی طرف دوبارہ دیکھا تو وہاں دس گیارہ برس کی پیاری سی لڑکی نظر آئی جو غور سے میری جانب دیکھ رہی تھی۔ چند لمحے دیکھنے کے بعد وہ وہاں سے ہٹ گئی۔ کچھ دیر بعد کمرے کا دروازہ کھلا اور سورج کی روشنی کے ساتھ ادھیڑ عمر کا دیہاتی بھی اندر آیا اور مجھے دیکھتے ہی بولا: ''شکر ہے رب کا صاحب جی کہ آپ کو ہوش آ گیا۔ گاؤں کے حکیم صاحب کہہ گئے تھے کہ صبح تک آپ کو ہوش آ جائے گا۔ رات کو وہ آپ کو دیکھ گئے تھے۔ مختلف جگہوں پر مرہم پٹی بھی انہوں نے کی ہے۔ کھانے کے لیے دوا بھی دی ہے۔

حکیم صاحب نے کہا ہے کہ چند دنوں میں آپ بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔'' اتنا کہہ کر اس نے باہر کی طرف منہ کر کے پکارا: ''ثمینہ بیٹی! صاحب جی کے لیے دودھ کا گلاس اور حکیم صاحب کی دی ہوئی دوا لے آ۔'' ''اچھا، ابا جی! ابھی لائی۔'' وہ فوراً مطلوبہ چیزیں لے آئی۔ میں نے دوا کی پڑیا کھول کر دیکھی تو پاؤڈر جیسی دوا تھی۔ دیہاتی بولا: ''اسے دودھ کے ساتھ کھا لیں صاحب جی! ہمارے حکیم صاحب کے ہاتھ میں بڑی شفا ہے۔'' میں نے وہ دوا دودھ کے ساتھ کھا لی۔ گاؤں کا خالص دودھ بڑے مزے کا تھا مگر دوا خاصی کڑوی تھی۔ نقاہت کے باعث مجھے بولنے میں دشواری تھی لیکن میں پھر بھی بولا:

''تم کون ہو، مجھے یہاں کون لایا ہے؟ اتنا تو مجھے یاد ہے کہ کچھ ڈاکوؤں نے میری کار رکوا کر مجھے لوٹ لیا تھا۔ مجھے کافی مارا بھی تھا، پھر مجھے ہوش نہیں رہا۔'' وہ ادھیڑ عمر دیہاتی بولا: ''صاحب جی! میرا نام رحیمو ہے۔ کل میں کسی کام سے شہر گیا ہوا تھا۔ رات کے نو بجے گاؤں واپس آ رہا تھا کہ کچی سڑک کے ساتھ والے کھیت میں مجھے ایک کار نظر آئی اور آپ کار سے خاصے فاصلے پر زخمی حالت میں زمین پر گرے پڑے تھے۔ میں نے آپ کو ہلایا جلایا مگر آپ بے سدھ پڑے رہے۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ آپ زندہ ہیں۔ میں فوراً اپنے گھر سے اپنے بیٹے کو لے کر آیا، پھر ہم دونوں آپ کو اُٹھا کر اپنے گھر لے آئے۔ یقیناً آپ کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آ گیا تھا۔ اب آپ نے بتا دیا ہے کہ آپ ڈاکوؤں کے ہتھے چڑھ گئے تھے۔ خدا غارت کرے ان لٹیروں کو۔ آپ کا مال تو وہ لے گئے ہوں گے مگر اللہ کا شکر ہے کہ آپ کی جان بچ گئی۔ آپ کی کار ادھر کھیت مین ہی کھڑی ہے۔ وہ کھیت میرا ہی ہے، میرے خاندان کی روزی روٹی کا وسیلہ ہے۔ اب آپ جب تک تندرست نہیں ہو جاتے ادھر ہی رہیں، مجھے اپنی خدمت کا موقع دیں۔''

میں کئی کئی دن کاروباری دوروں پر رہتا ہوں اور اپنے خاندان سے لاتعلق سا ہو جاتا ہوں۔ وہ میرے لیے فکرمند نہیں ہوتے ہیں، وہ جانتے بھی نہیں ہوں گے کہ اب میرے ساتھ کیا حادثہ پیش آ چکا ہے۔ میں نے سوچا کہ اپنے مینیجر سے رابطہ کر کے اسے ادھر بلاؤں تاکہ وہ مجھے یہاں سے کسی اچھے اسپتال میں لے جائے۔ میں اب یہاں سے جانا چاہتا تھا۔ اگرچہ میری کار ادھر کھیت میں ہی کھڑی تھی لیکن اپنی موجودہ حالت کے پیشِ نظر یہ ممکن نہیں تھا کہ خود کار چلا کر اپنے شہر تک پہنچتا۔ میں نے ٹھہر ٹھہر کر رنجیدہ لہجے میں کہا: ''تم بہت اچھے ہو رحیمو۔ مشکل وقت میں میرے بہت کام آئے ہو۔ مجھے اُٹھا کر اپنے گھر نہ لاتے، میری تیمارداری نہ کرتے تو نجانے میں زندہ بھی رہتا یا نہیں۔'' اتنا کہہ کر میں خاموش ہو گیا کیوں کہ میں بولتے بولتے تھک گیا تھا۔ رحیمو عاجزی سے بولا: ''ایسا نہ کہیں صاحب جی، جان بچانے والی ذات تو اللہ کی ہے۔ میں نے تو انسان ہونے کے ناتے آپ کی مدد کی ہے۔ حکیم صاحب نے آپ کو زیادہ بات کرنے سے منع کیا ہے، بس آپ آرام کریں۔'' میں نے رحیمو سے کہا: ''اچھا بھئی، اب میں زیادہ بات نہیں کروں گا۔ کیا تمھارے پاس موبائل فون ہے؟ میں نے اپنے ایک آدمی سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔'' اس نے جواب دیا: ''میرے پاس تو موبائل فون نہیں ہے لیکن میرے بیٹے کے پاس ہے، میں اسے بلاتا ہوں۔'' وہ وہاں سے جانے لگا تو میں نے کچھ سوچ کر کہا: ''رحیمو! میرا ایک کام اور کرو، میری کار تک جاؤ اور دیکھو اس میں کوئی چابی لگی ہوئی ہے کہ ڈاکو وہ بھی ساتھ لے گئے ہیں۔''

''جی، بہت اچھا صاحب جی۔'' پھر میں نے اس کو بتا دیا کہ کار میں چابی کہاں لگی ہو گی شاید وہ نہ جانتا ہو۔ کچھ دیر بعد اس کی واپسی ہوئی تو اس کے ہمراہ تقریباً اٹھارہ برس کا لڑکا بھی تھا جو یقیناً اس کا بیٹا تھا۔ اس نے مجھے سلام کیا۔ رحیمو بولا: ''صاحب جی، کار میں کوئی چابی نہیں ہے۔ میں نے اچھی طرح دیکھ لیا ہے، میرے خیال میں ڈاکو وہ ساتھ لے گئے ہیں۔'' میں افسوس سے سر ہلا کر رہ گیا۔ میں لیٹا ہوا تھا لیکن پھر میں اُٹھ کر چارپائی پر بیٹھ گیا تھا۔ رحیمو کے بیٹے نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا موبائل سیٹ مجھے دے دیا۔ میں نے نمبر ملا کر مینیجر کو ساری صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ وہ پریشان تو ہوا لیکن میری بات دھیان سے سنی۔ رحیمو کی مدد سے اس کے گاؤں کا پتا میں نے اپنے مینیجر کو اچھی طرح سمجھایا۔

کچھ دیر بعد رحیمو میرے مینیجر کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ مینیجر مجھے ایسی حالت میں وہاں دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔ اس کی حیرانی بجا تھی۔ اس نے تو کبھی سوچا بھی نہ ہوگا کہ میں اس سے اس حالت میں ملوں گا۔ میں نے ہمدرد رحیمو سے جانے کی اجازت لی۔ وہ بضد تھا کہ جب تک میں بالکل تندرست نہ ہو جاؤں، اسی کے گھر

پر رہوں مگر میں نے یہ مناسب نہ سمجھا۔ اس غریب خاندان نے مشکل وقت میں میری جتنی خدمت کی تھی، وہ کم نہ تھی۔ میں نے اپنے مینیجر سے دس ہزار روپے لے کر رحیمو کو دینا چاہے مگر اس نے وہ رقم لینے سے انکار کر دیا اور بولا: ”میں نے آپ کی مدد روپے پیسے کے لالچ کے لیے نہیں کی تھی۔ مجھے آپ رقم دے کر شرمندہ نہ کریں۔“ میں نے کہا: ”تم بہت اچھے انسان ہو، میں تمہارے جذبات کی قدر کرتا ہوں۔ یہ رقم انعام سمجھ کر رکھ لو، مجھے بڑی خوشی ہو گی۔ کافی پس و پیش کے بعد اس نے وہ رقم رکھ لی۔ میرا دل جو غریبوں کے لیے پتھر کا ہو چکا تھا، پگھل گیا تھا۔ اس گاؤں میں رات کا اندھیرا چھا گیا تھا، ہم وہاں سے روانہ ہو گئے۔ میرا مینیجر وہاں تک کرائے کی کار میں آیا تھا۔ واپسی کا سفر بھی اسی میں طے ہوا۔ میں تقریباً پندرہ دن اسپتال میں رہنے کے بعد بالکل صحت یاب ہو گیا تھا لیکن میرے ساتھ جو واقعہ پیش آیا تھا اس نے میری زندگی بدل کر رکھ دی تھی۔ میں جس دولت سے محبت کرتا تھا اسے تو ڈاکو لوٹ کر لے گئے تھے۔ غریبوں سے نفرت کرتا تھا مگر ایک غریب دیہاتی خاندان مشکل وقت میں میرے کام آیا۔ مجھے احساس ہو گیا کہ دولت صرف روپے پیسے کا نام ہی نہیں ہے بلکہ محبت، ہمدردی، مدد بھی روپے پیسے کی دولت سے ہرگز کم نہیں ہوتی ہے۔ میں جو غریبوں سے نفرت کرتا تھا، ان سے محبت کرنے لگا۔ ان کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آنے لگا۔ اپنی بے پناہ دولت سے ان کی مدد کرنے لگا اور مجھے دلی سکون اور اطمینان حاصل ہوا جو کسی دولت سے کم نہ تھا۔

☆☆☆

کمپیوٹر کی صفائی کیسے کریں؟

یہ بات درست ہے کہ دھول مٹی سے کمپیوٹر میں وائرس تو نہیں آتا، البتہ دھول مٹی کمپیوٹر کے لیے نقصان دہ ضرور ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر کمپیوٹر کو اس سے کیسے محفوظ رکھا جائے؟

عام طور پر سب سے پہلے کمپیوٹر میں نصب پنکھوں، موٹر اور کیسنگ میں دھول مٹی جمتی ہے اور ایک وقت ایسا آتا ہے کہ پنکھوں کے آگے پیچھے اتنی مٹی جم جاتی ہے کہ اس کی کارکردگی متاثر ہونے لگتی ہے اور پھر موٹر بھی گرم ہونا شروع ہو جاتی ہے اور بالآخر جل جاتی ہے۔ علاوہ ازیں پروسیسر کے اوپر نصب پنکھے کے ساتھ ایسا ہو تو پنکھے کو نقصان ہوتا ہے۔ پنکھے میں دھول مٹی جمنے کی ایک نشانی تو یہ ہے کہ اس کی آواز بڑھ جاتی ہے یا پھر بہت کم ہو جاتی ہے۔

بعض اوقات کمپیوٹر میں سافٹ ویئر پروگرام درست کام کر رہے ہوتے ہیں اور وائرس کے مسائل بھی موجود نہیں ہوتے، اس کے باوجود کمپیوٹر کی کارکردگی متاثر ہو رہی ہوتی ہے۔ ایسے میں عام طور پر آپ کے کمپیوٹر کو سست بنانے کی وجہ بھی یہی دھول مٹی ہوتی ہے جو کمپیوٹر ہارڈ ویئر پر جمی ہوتی ہے، جس سے کمپیوٹر کم استعمال ہونے کے باوجود زیادہ گرم ہو جاتا ہے۔

دھول مٹی پورٹ یا کنیکٹر کو بھی متاثر کرتی ہے کیونکہ یہ برقی رو کی روانی میں بھی رکاوٹ بنتی ہے۔ اگر آپ انٹرنیٹ کیبل استعمال کر رہے ہیں اور کئی عرصے سے پورٹ کی صفائی نہیں کی تو ممکن ہے کہ انٹرنیٹ کی رفتار سست ہو جائے۔ یو ایس بی پورٹ کے ساتھ بھی کچھ ایسے ہی مسائل ہوتے ہیں۔ کمپیوٹر کے کسی پرزے پر زیادہ دھول جم جائے تو اس سے شارٹ سرکٹ کا بھی خطرہ رہتا ہے جو زیادہ بڑے نقصان کا باعث ہو سکتا ہے۔

اس کا حل یہ ہے کہ مہینے میں ایک بار ضرور بلور کی مدد سے کمپیوٹر کی اچھی طرح صفائی کی جائے۔ اگر آپ ڈیسک ٹاپ کمپیوٹر استعمال کر رہے ہیں تو اسے بھی بلور کے ذریعے اچھی طرح صاف کیجیے۔ لیپ ٹاپ کی صفائی کے لیے اسے اُلٹا کیجیے اور اس کی پچھلی جانب بلور کے ذریعے اچھی طرح سے صفائی کیجیے۔

یاد رکھیے کہ پنکھوں والی جگہ پر زیادہ ہوا کا پریشر نہیں ڈالنا چاہیے کیونکہ ان میں استعمال ہونے والے پنکھے ڈی سی ہوتے ہیں۔ اس طرح یہ پنکھے گھومنے کے ساتھ بجلی بھی پیدا کرنے لگتے ہیں اور زیادہ کرنٹ بن جائے تو یہ کمپیوٹر میں موجود کسی بھی نازک پرزے کی موت کا سبب بن سکتا ہے۔

عام طور پر کمپیوٹروں میں درجہ حرارت معلوم کرنے کے لیے ایک ٹول موجود ہوتا ہے۔ اگر یہ ٹول آپ کے کمپیوٹر میں موجود نہیں تو آپ Core Temp انسٹال کر سکتے ہیں۔ اس پروگرام کے ذریعے کمپیوٹر کا درجہ حرارت بہ آسانی ناپا جا سکتا ہے۔ اس کے لیے صرف کمپیوٹر کو آن کیجیے اور پانچ منٹ تک کوئی دوسرا پروگرام لانچ نہ کیجیے۔ پھر کمپیوٹر کا درجہ حرارت معلوم کرنے والے ٹول کو لانچ کیجیے اور دیکھیے کہ اگر یہ درجہ حرارت 55 ڈگری سینٹی گریڈ ہے تو سمجھ لیجیے کہ آپ کا کمپیوٹر بالکل درست کام کر رہا ہے لیکن درجہ حرارت اس سے زیادہ ہے تو پھر ہوشیار ہو جائیے اور پھر درجہ حرارت بڑھے ہوئے ہونے کی وجوہ تلاش کیجیے۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ کمپیوٹر کے زیادہ گرم ہونے کی وجہ دھول مٹی بھی ہو سکتی ہے۔ اگر آپ کمپیوٹر کے ساتھ ہارڈ ڈسک کا درجہ حرارت بھی معلوم کرنا چاہتے ہیں تو اس کے لیے Crystal Disk Info پروگرام موجود ہے۔ یاد رہے کہ ہارڈ ڈسک کا درجہ حرارت ہمیشہ 20 سے 55 ڈگری سینٹی گریڈ کے اندر ہی ہونا چاہیے۔

شیخ عبدالحمید عابد

اُجلا بچپن روشن بڑھاپا

ہمارے قومی شاعر ڈاکٹر محمد اقبال 9 نومبر 1877ء کو سیال کوٹ میں پیدا ہوئے، ان کے محلے کا نام چوہدری وہاب تھا۔ آج کل اس جگہ کو اقبال اسٹریٹ کہتے ہیں۔ علامہ اقبال جس گھر میں پیدا ہوئے وہ ان کے دادا شیخ محمد رفیق نے 1861ء میں خریدا تھا۔

ابتدائی تعلیم پرانے طرز کے مکتب میں حاصل کی۔ یہاں ان کے اُستاد مولانا غلام حسین تھے۔ پھر مولوی میر حسن کے مکتب سے درس لیتے رہے۔ کچھ عرصے بعد انہی کے مشورے سے سیال کوٹ کے اسکاچ مشن اسکول میں داخل ہوئے۔ اسی اسکول میں چوتھی یا پانچویں جماعت میں پڑھ رہے تھے کہ ایک روز عجیب واقعہ ہوا۔ وہ مطالعہ میں مصروف تھے کہ اچانک اپنے حال میں مست ایک فقیر صورت بزرگ اندر داخل ہوئے اور بڑی شفقت سے ان کے سر پر ہاتھ پھیرا، پیشانی کو چوما اور بغیر کچھ کہے سنے واپس چلے گئے۔ اُستاد نے علامہ اقبال سے پوچھا، یہ بزرگ کون تھے؟ علامہ اقبال نے کہا کہ میں نے انہیں پہلی بار دیکھا ہے۔

بچپن ہی سے انہیں پڑھنے سے اتنی دل چسپی تھی کہ وہ رات کو نیند سے اُٹھ اُٹھ کر پڑھتے تھے۔ انہوں نے اپنے والد سے عہد کیا تھا کہ وہ تعلیم مکمل کرنے کے بعد اپنی ساری زندگی اسلام کی خدمت کے لیے وقف کریں گے۔

علامہ اقبال اپنے بچپن کے بارے میں کہتے ہیں: ”جب میں سیال کوٹ میں پڑھتا تھا تو صبح اُٹھ کر روزانہ قرآنِ پاک کی تلاوت کرتا۔ والد صاحب اپنے وظائف وغیرہ سے فارغ ہو کر آتے اور مجھے دیکھ کر گزر جاتے۔ ایک روز صبح جب میں حسبِ معمول قرآن مجید کی تلاوت کر رہا تھا تو وہ میرے پاس آئے اور فرمایا: ”بیٹا! جب تم قرآن مجید پڑھو تو یہ سمجھ کر پڑھو کہ جیسے اللہ تعالیٰ خود تم سے ہم کلام ہے۔“

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ اقبال نے جس ماحول میں تعلیم کے ابتدائی مراحل طے کیے، وہ کس قدر پاکیزہ تھے۔

کالج کی پڑھائی کے دوران جب وہ ہوسٹل میں رہتے تھے تو پڑھائی کا یہ عالم تھا کہ ایک روز کالج کے پرنسپل صاحب ہوسٹل کا چکر لگاتے ہوئے علامہ اقبال کے کمرے کی طرف آ نکلے اور انہیں پڑھتے دیکھ کر کہنے لگے کہ تمام لڑکے باہر کھیل کود اور ورزش میں مصروف ہیں اور تم یہاں پڑھ رہے ہو۔ اقبال نے مؤدبانہ جواب دیا: ”جناب! یہ بھی تو ایک طرح کی ورزش ہے۔“

آپ اپنے اساتذہ کا بہت احترام کرتے تھے۔ بچپن کا قصہ

مشہور ہے کہ آپ ایک دفعہ کسی دُکان پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اتفاق سے حضرت علامہ میر حسن آتے دکھائی دیے۔ آپ جوتے اُتار کر بیٹھے ہوئے تھے۔ اسی طرح ننگے پاؤں مولوی میر حسن کی طرف بڑھے اور ان کے ساتھ ہو لیے۔ مولوی صاحب کو گھر پہنچا کر واپس لوٹے اور پھر جوتے پہنے۔ اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ آپ اپنے اساتذہ کا احترام کس حد تک کرتے تھے۔ حاضر جوابی میں ایک ایسی مثال جو اقبال کو سب سے منفرد مقام عطا کرتی ہے، اسکول میں تعلیم حاصل کرنے کے دوران ایک دن آپ کو اسکول پہنچنے میں دیر ہوگئی۔ اُستاد صاحب نے دیر سے آنے کا سبب دریافت کیا تو آپ نے بے ساختہ جواب دیا کہ ''اقبال ہمیشہ دیر سے آتا ہے۔'' اس عمر میں یہ جواب، اس ذہانت پر اُستاد اور سبھی دنگ رہ گئے۔

بچپن ہی سے آپ ہمیشہ صبح تہجد کے وقت بیدار ہوتے اور قرآن مجید کی تلاوت خوش الحانی سے کرتے۔ لفظ لفظ پر غور کرتے اور روتے رہتے تھے، یہاں تک کہ قرآن مجید کے اوراق آپ کے آنسوؤں سے تر ہو جاتے۔ یہ قرآن مجید اب تک اسلامیہ کالج لاہور کی لائبریری میں موجود ہے اور آنسوؤں کے نشان اس پر اب تک موجود ہیں۔

علامہ اقبال کو آنحضرت محمد ﷺ سے بے حد عشق تھا۔ آپ کے نزدیک عشق رسولؐ ہی مسلمانوں کے لیے دین اور دُنیا کی فلاح کا موجب ہے۔

اعمال حسنہ کے متعلق آپ نے ایک مجلس میں فرمایا کہ یہ کبھی ضائع نہیں جاتے۔ اس ضمن میں آپ نے اپنے والد محترم کا یہ واقعہ بیان کیا۔ ایک روز شیخ نور محمد رومال میں تھوڑی سی مٹھائی لیے گھر آ رہے تھے۔ انہوں نے راستے میں ایک کتے کو بھوک پیاس کے مارے دم توڑتے دیکھا۔ آپ نے مٹھائی اس کتے کے آگے ڈال دی اور کہیں سے پانی لا کر پلایا۔

انہوں نے رات کو خواب دیکھا، جس سے انہیں یقین ہو گیا کہ اب ان کے دن پھرنے والے ہیں۔ اس واقعے کے بعد کسی کے کہنے پر میرے والد نے دھسول (گرم شالیں) کی تجارت شروع کی جس میں اچھا خاصا نفع ہوا اور ہمارے دن پھر گئے۔

بچپن میں آپ کے والد نے ایک دن آپ سے کہا کہ میں نے تمہارے پڑھانے لکھانے میں جو محنت صرف کی ہے، اس کا معاوضہ چاہتا ہوں۔ آپ نے بڑے شوق سے پوچھا کہ وہ کیا ہے؟

آپ کے والد نے کہا، جب تعلیم مکمل کرلو تو اسلام کی خدمت کرنا۔ علامہ اقبال کہتے ہیں کہ جب میں نے پڑھائی سے فارغ ہو کر لاہور میں وکالت شروع کی تو اس کے ساتھ ہی میری شاعری کا چرچا پھیلا اور نوجوانوں نے اس کو اسلام کا ترانہ بنایا۔ پھر دوسری نظمیں لکھیں تو لوگوں نے ان کو ذوق و شوق سے سنا اور سامعین میں ولولہ پیدا ہونے لگا۔ ان ہی دنوں میں میرے والد بیمار ہو گئے، میں ان کو دیکھنے لاہور سے سیالکوٹ آیا۔ ایک دن میں نے اپنے والد بزرگوار سے پوچھا: ''آپ سے جو میں نے اسلام کی خدمت کا عہد کیا تھا وہ پورا کیا یا نہیں؟'' باپ نے بستر مرگ پر شہادت دی کہ میرے جگر کے ٹکڑے تم نے میری محنت کا معاوضہ ادا کر دیا ہے۔

آپ نے اپنے اشعار کے ذریعے مسلمانوں، خاص طور پر نوجوانوں اور بچوں میں اسلامی اور سیاسی شعور بیدار کیا اور طلبا کی تربیت پر خصوصی توجہ دی۔ نوجوانوں کے لیے اُردو اور فارسی میں بہت ساری نظمیں لکھیں۔ اپنی شاعری میں انہوں نے نوجوانوں کے جذبہ حب الوطنی اور محبت کو اُبھارنے پر توجہ دی۔

علامہ اقبال نے اپنی شاعری کے ذریعے نہ صرف مسلمانوں میں غلامی سے نجات حاصل کرنے کا جذبہ بیدار کیا بلکہ آپ کی شاعری اسلامی تعلیمات کی آئینہ دار ہے۔ آپ نے اپنے شعروں کے ذریعے اتحاد کا درس دیا۔ اپنے آپ کو پہچاننے کی تعلیم دی اور آپس میں محبت و اخوت سے رہنے کی نصیحت کی۔ علامہ اقبال کی شاعری میں نہ صرف بڑوں کے لیے سبق ہے بلکہ آپ نے بچوں اور نوجوانوں کے لیے بھی بہت اچھی اور پیاری پیاری نظمیں لکھیں جنہیں آج بھی سب ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں۔

آپ نے بچوں کے لیے نظم ''دُعا'' لکھی جو آج بھی ہر اسکول میں اسمبلی کے دوران پڑھ کر بچے عہد کرتے ہیں کہ وہ آپ کی نصیحتوں پر عمل کر کے نیک انسان بننے کی کوشش کریں گے۔ دعا کے الفاظ ہیں:

''لب پہ آتی ہے دُعا بن کے تمنا میری
زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری
دُور دُنیا کا میرے دم سے اندھیرا ہو جائے
ہر جگہ میرے چمکنے سے اُجالا ہو جائے''

نظم ''پرندے کی فریاد'' میں علامہ اقبال تلقین فرماتے ہیں کہ پرندوں کو پنجروں میں بند کرنا اچھا نہیں ہے۔ کسی کی آزادی کو سلب کرنا گناہ ہے۔ ایک قیدی کے قید و قفس میں جو تاثرات ہوتے ہیں انہیں اس نظم میں نہایت خوبی سے بیان کیا گیا ہے۔

نظم ''ہمدردی'' میں بچوں کے لیے کئی سبق ہیں۔ علامہ اقبال

بچوں کو نصیحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں، جو لوگ وقت ضائع کرتے ہیں وہ پچھتاتے ہیں کیوں کہ گیا وقت پھر ہاتھ نہیں آتا۔ اچھے لوگ دوسروں کی خدمت کرتے ہیں۔ دوسروں کی تکلیف میں کام آنا ہی سب سے بڑی نیکی ہے۔ بقول علامہ اقبال

ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے
آتے ہیں جو کام دوسروں کے

نظم ''مکڑا اور مکھی'' کہنے کو تو یہ ایک منظوم کہانی ہے مگر اس میں عقل والوں کے لیے بہت سے سبق ملتے ہیں۔ لوگ اپنا مطلب پورا کرنے کے لیے دوسروں کو کئی فریب دیتے ہیں۔ اپنا اُلو سیدھا کرنے کے لیے دوسروں کی جھوٹی تعریف اور خوشامد کرتے ہیں۔ خوشامد کرنا اچھی بات نہیں۔ اس سے آدمی دھوکا کھا جاتا ہے۔ شاعر مشرق فرماتے ہیں:

سو کام خوشامد سے نکلتے ہیں جہاں میں
دیکھو جسے دُنیا میں خوشامد کا ہے بندہ

23 مارچ 1930ء کو خطبۂ صدارت آل انڈیا مسلم لیگ کانفرنس میں فرمایا:

''میری آرزو ہے کہ میں اپنے ملک کے تعلیم یافتہ لوگوں پر دین کے اسرار منکشف کر جاؤں تاکہ وہ دین کے قریب آ جائیں۔ آپ نے نوجوان نسل کو یکجا کیا اور انہیں صحیح معنوں میں اسلامی تعلیمات سے روشناس کرایا۔

جوانوں کو میری آہ سحر دے
پھر ان شاہین بچوں کو بال و پَر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے
میرا نورِ بصیرت عام کر دے

علامہ اقبال نے اپنے آفاقی خیالات کا اظہار شعر و شاعری کے ساتھ نثر میں بھی کیا ہے۔ اس سلسلے میں مابعد النظریات، مختلف شخصیات کو لکھے گئے خطوط و تقاریب میں پڑھے جانے والے مکالے اور اظہارِ خیال سے ان کے افکار و خیالات موجود ہیں جو یقیناً ہمارے لیے مشعلِ راہ ہیں۔ اقبال کے پیغام کی خاص بات یہ ہے کہ وہ قرآنِ پاک باقاعدگی سے معنی و مطالب کے ساتھ پڑھتے تھے، لہٰذا اس کا اثر ان کے افکار پر بھی پڑا اور ان کی نظم و نثر میں قرآن کا پیغام کوٹ کوٹ کر بھرا پڑا ہے جس سے ان کے پیغام نے آفاقی اور عالمگیر حیثیت اختیار کر لی ہے۔

1922ء میں اُردو اور فارسی شاعری میں دلوں کو گرما دینے والے کلام کے باعث حکومتِ برطانیہ نے انہیں سر کا خطاب دیا۔

علامہ اقبال آل انڈیا کشمیر کمیٹی، انجمن حمایتِ اسلام لاہور اور پنجاب مسلم لیگ کے صدر بھی رہے۔

1930ء میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس الٰہ آباد میں انہیں آل انڈیا مسلم لیگ کا صدر بھی منتخب کیا۔ اسی تاریخی اجلاس میں آپ نے اپنے پیارے وطن پاکستان کا تصور پیش کیا۔ اپنے اس تصور میں رنگ بھرنے کے لیے علامہ اقبال نے قائداعظم محمد علی جناح کو مسلمانوں کی قیادت کرنے پر مجبور کیا جن کی سربراہی میں 14 اگست 1947ء کو مملکت پاکستان کا قیام عمل میں آیا۔

دینِ اسلام اور انسانیت کا درس دیتے ہوئے مصورِ پاکستان 21 اپریل 1938ء کو خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے اس عظیم شاعر پر ہزاروں رحمتیں نازل کرے جس کا بچپن بھی اُجلا تھا اور بڑھاپا بھی روشن تھا۔ ☆☆☆

علامہ اقبالؒ کی دیانت داری

پٹنہ (بہار) کی عدالت میں ''ریاست آرہ'' کی جائیداد سے متعلق ایک مقدمہ آیا۔ عدالت کو اس سلسلے میں ایک قدیم فارسی مخطوطے کی وضاحت درکار تھی۔ مخطوطے کی تحریر پیچیدہ اور قدیم فارسی پر مشتمل ہونے کی وجہ سے قابل فہم نہ تھی۔ اس گتھی کو سلجھانے کے لیے عدالت کی نگاہِ انتخاب علامہ اقبال پر پڑی اور آپ سے درخواست کی گئی کہ اس مخطوطے سے متعلق عدالت کی راہ نمائی فرمائیں۔ اس کام کے لیے عدالت نے یومیہ 1000 روپے کا مشاہرہ طے کیا اور ساتھ ہی پیش کش کی کہ اگر آپ کو متعلقہ کام میں معاونت کے لیے کلکتہ بھی جانا پڑے تو وہ اخراجات بھی برداشت کیے جائیں گے۔ علامہ اقبال جس روز پٹنہ پہنچے، اسی رات کاغذات کا معمہ حل کر کے اگلے روز کاغذات متعلقہ افراد کے حوالے کر دیئے۔ بیرسٹر سی آر داس جو یہ مقدمہ دیکھ رہے تھے، نے حیران ہوتے ہوئے علامہ سے فرمایا: ''آپ نے یہ کیا کیا!! یہ کام تو آپ کو کئی دنوں میں کرنا تھا، آپ کا مشاہرہ ہزار روپے یومیہ مقرر ہوا ہے کم از کم دو چار ہزار تو بنتے۔'' یہ سن کر علامہ اقبال نے جواب دیا۔ ''میرے رسولؐ نے مجھ پر ایسی کمائی حرام کر دی ہے جو کسی مختصر کام کو طول دے کر لی جائے۔''

یہ واقعہ آپ کی دیانت داری اور قابلیت و ذہانت کی عکاسی کرتی ہے۔ اللہ سے دعا ہے کہ ہم سب مسلمانوں کو علم پر عمل کرنے کی توفیق دے۔ غیرت و بے نفسی کی صفات کا پیکر بنا دے، جیسا کہ علامہ اقبالؒ نے فرمایا:

دل کی آزادی شہنشاہی ، شکم سامانِ موت
فیصلہ ترے ہاتھ میں ہے ، دل یا شکم

فن محمد عرشی

کھڑکھانڈ سویٹ شاپ

چھوٹے والا بھی بلا کا ذہین ہے، خاص طور پر کھانے پینے کے معاملے میں تو اس کا ذہن 'کور آئی 7' سے بھی تیز چلتا ہے۔ اس بار بھی چھوٹے والا غضب کا آئیڈیا لایا تھا۔

''دوستو! خوش ہو جاؤ۔ آپ کے لیے ایسا آئیڈیا لایا ہوں کہ آپ کی روح کانپ اُٹھے گی۔'' چھوٹے والا نے کسی مداری کی نقل اُتاری۔

''کیا مطلب......؟'' دادابڈی نے آنکھیں نکالیں۔ ''کیا آئیڈیا اتنا ہی خوفناک ہے؟''

''ارے ارے...... نہیں تو!'' چھوٹے والا نے بوکھلا کر کہا۔ ''آئیڈیا تو بہت مزے کا ہے۔ ایک دم فرسٹ کلاس!''

''ارے بے وقوف!'' گنجے والا نے جھلا کر کہا۔ ''تمہیں یوں کہنا چاہیے تھا کہ آئیڈیا سن کر آپ کی روح بھی خوشی سے جھوم اُٹھے گی!''

''چھوڑو یار! نہیں......'' مبارکاں نے بے صبری سے کہا۔ ''اپنا آئیڈیا بتاؤ جلدی سے...... شاید مرغی کا سکوپ بن جائے۔''

''مبارکاں، زندہ باد!'' ملنگی نے نعرہ لگانے والے انداز میں کہا۔ ''واقعی مرغی کھائے اتنا عرصہ ہو گیا ہے کہ زبان اس کا ذائقہ بھی بھول گئی ہے۔''

''بلکہ ہماری حالت تو اس مہمان کی سی ہو گئی ہے......'' دادا بڈی نے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''جو کسی کے گھر گیا تو میزبان نے اسے لگاتار چودہ دن تک دال کھلائی۔ اگلے دن اس نے مہمان سے پوچھا۔ ''جناب! آج چاند کی کون سی تاریخ ہے؟''

مہمان نے جل کر کہا۔ ''چاند کا تو پتا نہیں البتہ دال کی آج پندرہ تاریخ ہے!''

سارے کھڑکھاندی ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو گئے۔ جب ذرا سنبھلے تو چھوٹے والا نے کہا۔ ''اچھا اب جلدی سے آئیڈیا سن لو، ہم ایک سویٹ شاپ کھولیں گے۔ پیسے بھی کمائیں گے اور خود بھی کھائیں گے۔ یار اس دھندے میں بڑی بچت ہے اور پھر پیٹ پوجا بھی فری......!!!'' آئیڈیا سن کر سب لوگ خوشی سے اُچھل پڑے، آئیڈیا تو واقعی کمال کا تھا!

''لیکن......'' گنجے والا نے اپنا گنجا سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''مٹھائیاں تیار کون کرے گا؟ نہیں نہیں...... یہ کام بے حد مشکل ہے!''

''آج کل کے دور میں کوئی مشکل نہیں۔'' چھوٹے والا نے فاتحانہ انداز میں کہا۔ ''یہ دیکھو!''

اس نے اپنی جیب سے ایک کتاب نکال کر ہوا میں لہرائی۔

مبارکاں نے فوراً جھپٹ کر سب کے آگے رکھ دی۔ کتاب کے ٹائٹل پر لکھا تھا: 101 مزیدار پکوان

گھر بیٹھے پاکستانی، جاپانی، امریکی اور سوئس مٹھائیوں اور کھانوں کا لطف اُٹھائیں!

''واہ جی واہ......'' گنجے والا نے چہک کر کہا۔ ''یہ ہوئی ناں بات!''

''اور مٹھائیاں تیار کرنے کا کام تم ہم تینوں پر چھوڑ دو...... مبارکاں، چھوٹے والا اور میں......'' دادا بڈی نے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ''کیوں ساتھیو؟''

''بالکل بالکل......'' چھوٹے والا اور مبارکاں نے خوشی سے اُچھلتے ہوئے کہا۔ ''ایسی ایسی مٹھائیاں بنائیں گے کہ لوگ حافظ کے ملتانی سوہن حلوے کو بھول جائیں گے!''

''او کے...... او کے......'' گنجے والا نے ہاتھ اُٹھا کر کہا۔ ''میں اور ملنگی کاؤنٹر سنبھالیں گے!''

''اور دُکان کا نام کیا رکھیں گے؟'' چھوٹے والا نے پوچھا۔

''ارے، یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟'' گنجے والا نے چہک کر کہا۔ ''اس کا نام ہوگا...... کھڑکھاند سویٹ شاپ!''

''گونا سویٹ شاپ نہ رکھ دیں......؟'' مبارکاں نے گنجے والا کی طرف دیکھتے ہوئے شرارت بھرے لہجے میں کہا۔

گنجے والا اسے مارنے کو دوڑا لیکن مبارکاں نے دوڑ لگا دی۔ سب لوگ قہقہے لگانے لگے۔

دو کڑاہیں چولھوں پر چڑھی ہوئی تھیں اور کھڑکھاند سویٹ شاپ کے لیے مٹھائیاں تیار کرنے کا کام زور شور سے جاری تھا۔ چھوٹے والا اور مبارکاں خام مال تیار کر رہے تھے اور دادا بڈی اور ملنگی اسے تل رہے تھے۔ گنجے والا دُکان کی سیٹنگ میں لگا ہوا تھا۔ دُکان کا انتظام یوں ہوا تھا کہ ملنگی کی بیٹھک آج کل فارغ پڑی تھی، اسی پر کھڑکھاند سویٹ شاپ کا بورڈ لگا دیا گیا تھا۔ مبارکاں کے ایک دوست کا شوکیس فارغ پڑا تھا، چنانچہ وہ عاریتاً اٹھا لائے تھے۔ کڑاہیاں ملنگی اور دادا بڈی لے آئے تھے۔ باقی سامان کے لیے فنڈ جمع کر لیا گیا تھا، جس میں زیادہ حصہ یعنی Lion's Share گنجے والا کا تھا!

چھوٹے والا نے '101 مزیدار پکوان' والی کتاب سامنے کھول رکھی تھی اور مبارکاں کو پڑھ پڑھ کر ہدایات دے رہا تھا: ''میدا ایک کلو...... چینی ایک پاؤ...... کچا کھویا 200 گرام......''

اور مبارکاں جھٹ پٹ اس کی تعمیل میں لگا ہوا تھا۔

اچانک دادا بڈی نے چھوٹے والا کو آواز دی۔ ''ارے ذرا دیکھنا، گھی تو کڑکڑا رہا ہے...... اب لڈو اس میں ڈال کر تل دوں؟''

چھوٹے والا نے کتاب ایک طرف رکھی اور دادا بڈی کے پاس چلا گیا۔ پھر تھوڑی دیر بعد واپس آ کے لکھوانے لگا۔ ''کالی مرچ 100 گرام...... ادرک پسی ہوئی...... حسبِ ذائقہ......''

''کالی مرچ......'' مبارکاں نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔ ''یہ آئیٹم اپن کی سمجھ میں نہیں آیا...... گلاب جامن میں کالی مرچ کہاں سے آ گئی......؟''

''اوہ...... احمق کہیں کے......'' چھوٹے والا نے دانت پیس کر کہا۔ ''یہ بتا...... گلاب جامن کا رنگ کون سا ہوتا ہے؟''

''کالا......'' مبارکاں نے جلدی سے کہا۔

''اور کالا رنگ انہی کالی مرچوں کی وجہ سے ہوتا ہے!'' چھوٹے والا نے اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا۔

''اچھا اچھا...... اب آگے بتاؤ...... سمجھ گیا!'' مبارکاں نے جان چھڑاتے ہوئے کہا۔

......اور پھر جب مٹھائی کی پہلی کھیپ تیار ہوئی تو مبارکاں نے ایک گلاب جامن پر ہاتھ صاف کرنا چاہا مگر عین اسی وقت گنجے والا کسی جن کی طرح نازل ہو گیا تھا۔ ''خبردار! کوئی مٹھائی کو ہاتھ نہیں لگائے گا۔ یہ بات پہلے ہی طے ہوئی تھی کہ افتتاح سے پہلے کوئی مٹھائی نہیں کھائے گا۔ کل شام کو جتنی مرضی آئے، کھانا!''

مبارکاں اپنا سا منہ لے کر رہ گیا تھا۔ چھوٹے والا نے بھی اس طرح منہ بنایا تھا، جیسے 'کونین' کا پورا پیکٹ اس کے حلق میں اُتر گیا ہو۔ وہ شاید دو تین کلو مٹھائی خود ہڑپ کرنے کی آس لگائے بیٹھا تھا۔ اس نے خالی پیٹ پر ہاتھ پھیرا اور گنجے والا کو خوں خوار نظروں سے گھورتا ہوا ملنگی کی طرف چلا گیا۔

غرض ایک پورا دن دُکان کی سیٹنگ اور مٹھائیوں کی تیاری میں گزر گیا۔ چنانچہ اگلے دن جمعہ کو دُکان کا افتتاح ہونا قرار پایا۔ اگرچہ پیکنگ کرتے وقت گنجے والا نے مٹھائیوں کی عجیب و غریب رنگت دیکھ کر ناک بھوں چڑھائی تھی لیکن دادا بڈی نے اسے یہ کہہ کر مطمئن کر دیا تھا کہ رنگت پر نہ جائیے...... ان کا ذائقہ بے مثال ہوگا!

......☆......

'کھڑکھاند سویٹ شاپ' کا افتتاح ہو گیا تھا۔ محلے کے پندرہ، بیس چیدہ چیدہ لوگوں کو دعوت دی گئی تھی۔ گنجے والا نے ایک پُراثر تقریر بھی کی تھی، جس میں کھڑکھاند سویٹس کی شان میں زمین آسمان

کے قلابے ملائے تھے اور فراز کا ایک شعر بھی ٹانک لیا تھا۔

جب غمِ دُنیا سے جی گھبرا جائے فراز
تو کھڑکھاندی سویٹس سے دل کو بہلایئے

اللہ جانے، یہ شعر فراز کا تھا یا نہیں......؟ ہمیں تو اتنا پتا ہے کہ آج کل لوگ اپنا اُلّو سیدھا کرنے کے لیے فراز کی مٹی پلید کرنے سے دریغ نہیں کرتے......!

بہر حال مہمانوں کی چائے اور اعلیٰ کوالٹی کے بسکٹس سے تواضع کی گئی۔ اس کے بعد مہمانوں نے دھڑا دھڑ مٹھائیاں خریدیں۔ یہاں گنجے والا نے ذرا سیاست سے کام لیا تھا۔ اس نے مٹھائی پہلے ہی آدھا کلو، ایک کلو اور ایک پاؤ کے پیکٹس میں پیک کروا دی تھی، مبادا کہ کوئی اس کی خوفناک شکل دیکھ کر بدک نہ جائے۔

مہمانوں کے علاوہ کچھ اور لوگ بھی مٹھائی لے گئے تھے۔ الغرض دو ہی گھنٹوں میں تیار کردہ تمام مٹھائی ہاتھوں ہاتھ بک گئی۔ کیونکہ تجرباتی طور پر صرف دس کلو مٹھائی تیار کی گئی تھی۔

گنجے والا نے حساب کیا تو خوشی سے کِھل اُٹھا۔ ''آہا! پہلے ہی دن ہزار روپے کی بچت...... زبردست!''

یہ سن کر مبارکاں نے اُچھل کر نعرہ لگایا۔ ''کھڑکھاند سویٹ شاپ!''
سب نے چلاّ کر جواب دیا۔ ''زندہ باد!''

مبارکاں اور چھوٹے والا کے چہرے بھی خوشی سے کِھل اُٹھے تھے جو پہلے مٹھائی ختم ہوتے دیکھ کر لٹکنے کے لیے کوئی مناسب زاویہ ڈھونڈ رہے تھے کیونکہ ساری کی ساری مٹھائی بک گئی تھی، کسی نے چکھی تک نہیں تھی۔

خوشی کا یہ وقت مختصر ثابت ہوا۔ اچانک ایک لڑکا دُکان میں داخل ہوا جو تھوڑی دیر پہلے لڈو لے گیا تھا۔ اس نے آتے ہی کھڑکھاند گروپ کو خونی نظروں سے گھورا اور کہا: ''ذرا ہتھوڑا تو دینا...... ابا جی نے منگوایا ہے۔''

گنجے والا کا ماتھا ٹھنکا۔ ''کک...... کیوں...... ہتھ...... ہتھوڑا کیوں؟''

لڑکے نے جل کر کہا۔ ''لڈو توڑنے کے لیے...... جو ابھی لے کر گیا تھا......!''

گنجے والا نے گھور کر دادا بڈی اور ملنگی کی طرف دیکھا۔ دادا بڈی نے گھبرا کر کہا۔ ''وہ...... وہ...... میں نے سوچا کہ...... زیادہ پکیں گے تو...... سس...... سواد زیادہ آئے گا!''

''اوہ! ......'' گنجے والا نے دانت کچکچائے...... پھر وہ لڑکے کو پچکارتے ہوئے بولا۔ ''اچھا بیٹے...... تم ایسا کرو کہ لڈوؤں کو پانی میں گھول کر پی جاؤ...... ذائقہ تو پھر بھی لڈوؤں ہی کا آئے گا ناں...... شربت کے ساتھ لڈو کا مزہ، یعنی ایک ٹکٹ پر دو شو......!''

مبارکاں اور چھوٹے والا اپنی ہنسی دبانے کی ناکام کوشش کر رہے تھے کیونکہ 'کھی کھی' کی ہلکی ہلکی آوازیں تو نکل ہی رہی تھیں۔

''کیا یہ پتھر مارکہ لڈو پانی میں گھل جائیں گے؟'' لڑکے نے مشتبہ لہجے میں کہا۔

''کیوں نہیں بیٹا...... کل تک ان کا نام و نشان بھی مٹ جائے گا۔'' گنجے والا نے اسے تسلی دی۔

''نام و نشان تو تمہارا بھی مٹ جائے گا...... فراڈیئے کہیں کے!''
لڑکے نے غصے سے بڑبڑاتے ہوئے کہا اور دُکان سے نکل گیا۔

''ہنس لو بیٹے ہم پر......'' ملنگی نے مبارکاں اور چھوٹے والا پر

آنکھیں نکالتے ہوئے کہا۔ ''ابھی تمہاری باری بھی آنے والی ہے۔''
''کک...... کیا مطلب؟'' گنجے والا گھبرا گیا۔ ''کیا انہوں نے بھی کوئی گھپلا کیا ہے؟'' اس سے پہلے کہ کوئی اس کی بات کا جواب دیتا، دو آدمی آندھی اور طوفان کی طرح اندر داخل ہوئے۔
''یا اللہ خیر...... آثار کچھ ٹھیک دکھائی نہیں دیتے۔'' دادا بڑی اپنے ماتھے سے پسینا صاف کرتے ہوئے بڑبڑایا۔
''یہ گلاب جامن کس گدھے نے بنائے ہیں؟'' ایک آدمی کاؤنٹر پر ہاتھ مار کر دھاڑا۔
''کیوں جناب! خیر تو ہے...... آپ نے چھوٹتے ہی ہمیں گدھا کہہ دیا۔ خیر، کوئی بات نہیں، آپ ہمارے بزرگ ہیں لیکن وجہ تو بتائیں!'' گنجے والا نے اسے بڑی خوب صورتی سے بڑا گدھا بناتے ہوئے کہا۔
گنجے والا کا جواب سن کر مارے شرمندگی کے اس کا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ اب وہ بولا تو اس کا لہجہ کافی پُرامن تھا۔
''دیکھیے! میں کہتا ہوں، یہ مٹھائی ہے یا 'مرچائی'......؟''
''جج...... جناب...... مم...... میں سمجھا نہیں!'' اب تو گنجے والا بھی گھبرا گیا۔
''ذرا اسے چکھ کر دیکھیں ناں...... سب کچھ سمجھ جائیں گے۔'' دوسرے آدمی نے پہلی بار زبان کھولی۔
''کیوں...... کیا ہے اسے......؟'' گنجے والا نے ایک گلاب جامن ہاتھ میں لے کر اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا اور پھر اس نے وہ گلاب جامن منہ میں ڈال کر منہ چلایا ہی تھا کہ اس کے چودہ کیا، اٹھارہ طبق روشن ہو گئے۔ اسے یوں لگا جیسے کریلا منہ میں ڈال لیا ہو...... اور وہ بھی نیم چڑھا!
گنجے والا ''تھو تھو'' کر کے گلاب جامن اُگلنے لگا۔
''یہ کیا بے ہودگی ہے......'' گنجے والا نے گرج کر کہا۔ ''اس میں کالی مرچیں کس گدھے نے شامل کر دیں؟''
''چھوٹے والا نے......!'' مبارکاں نے جھٹ پٹ کہا۔ ''میں نے اسے کہا بھی تھا کہ گلاب جامن میں کالی مرچیں کہاں سے آ گئیں...... تو یہ اُلٹا مجھ پر پلٹ پڑا کہ تمہیں اتنا بھی نہیں پتا کہ کالا رنگ کالی مرچوں کی وجہ سے ہوتا ہے؟''
گنجے والا کا مارے غصے کے دماغ گھوم گیا۔ ''کیوں بے؟''
چھوٹے والا نے بوکھلا کر کہا۔ ''مگر میں بے قصور ہوں، پکانے کی ترکیب میں یہی لکھا ہوا تھا۔ یہ اِدھر دیکھیے......''

چھوٹے والا نے جلدی سے کھانوں والی کتاب شوکیس سے نکال کر سب کے سامنے کر دی۔
''کہاں لکھا ہے...... ذرا دکھانا۔'' سب کتاب پر جھپٹ پڑے۔ گلاب جامن کے اجزاء میں کالی مرچ کہیں نظر نہیں آئی۔ سب نے گھور کر چھوٹے والا کو دیکھا۔ اس نے گھبرا کر ایک ورق آگے پلٹ دیا۔ پہلی ہی سطر میں لکھا تھا۔ ''کالی مرچ 100 گرام...... ادرک پسی ہوئی...... حسبِ ذائقہ......''
سب نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا، اس نے بوکھلا کر کہا۔ ''دراصل بات یہ ہے کہ آدھے اجزاء لکھوا کر میں دادا بڑی کے پاس چلا گیا تھا۔ کتاب وہیں کھلی پڑی تھی، شاید ہوا کے کسی شریر جھونکے نے ایک ورق آگے الٹ دیا تھا......!''
اس سے پہلے کہ سارے کھڑکھاندی چھوٹے والا کو آڑے ہاتھوں لیتے، اچانک چشتی صاحب گھبرائے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ ''دُکان بند کر دو...... فوراً......'' انہوں نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ''میرے دادا جان عصا لے کر دوڑے چلے آ رہے ہیں اور بہت غصے میں ہیں۔''
''ارے مگر کیوں...... اور کیا وہ ابھی دوڑنے کے قابل ہیں...... اس عمر میں......'' گنجے والا نے بوکھلا کر کہا۔
''ارے...... صحت تو ان کی آج کل کے نوجوانوں سے بھی بہتر ہیں۔ ہاں! بس منہ میں دانت نہیں رہے تھے۔ پچھلے دنوں پانچ ہزار کے لگوائے ہیں...... اور وہ غصے میں کیوں ہیں......؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ سب اس کھڑکھاندی حلوے کا کمال ہے جو دادا بڑی نے مجھے دادا جان کے لیے تحفہ دیا تھا...... کہ نرم و ملائم چیز ہے...... کھا کر خوش ہوں گے۔'' چشتی صاحب نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔
''تو کیا وہ نرم و ملائم نہیں تھا......؟'' دادا بڑی نے حیرت سے پوچھا۔
''تھا تو نرم و ملائم...... مگر وہ ان کے دانتوں میں چپک گیا۔'' چشتی صاحب نے جل کر کہا۔ ''اور الگ ہونے کا نام ہی نہ لیتا تھا...... جب زیادہ زور لگایا تو پوری بتیسی باہر آ گئی جو پچھلے ہفتے ہی لگوائی تھی۔''
''ارے باپ رے...... مارے گئے پھر تو......'' دادا بڑی نے کانپ کر کہا۔
گنجے والا کو بروقت ہوش آیا تھا، اس نے چلّا کر ملنگی سے کہا۔ ''ارے، جلدی سے دروازہ بند کرو۔''
ملنگی دروازے کی طرف لپکا لیکن دیر ہو چکی تھی۔ چشتی صاحب

کے دادا جان کسی جن کی طرح نمودار ہو چکے تھے اور ان کے ہاتھ میں عصا تھا۔

ظاہر ہے پہلا نشانہ ملنگی ہی بنا تھا۔ عصا کا مڑا ہوا حصہ اس کی گردن میں پڑا تھا اور ملنگی لڑھکتا ہوا دُکان سے باہر جا گرا تھا۔ اس کے حلق سے ایک دلخراش چیخ نکلی تھی۔

اتنے میں دادا جی اندر داخل ہو چکے تھے۔ انہوں نے لاٹھی کی طرح عصا گھمایا۔ نشانہ دادا بڈی کا لیا تھا، لیکن وہ جھکائی دے کر سائیڈ پر نکل گیا۔ چنانچہ عصا اس آدمی کے پہلو میں لگا، جو گلاب جامن لایا تھا اور وہ ڈکراتا ہوا فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ اس کا ساتھی دُکان سے ایسے بھاگا، جیسے موت کا فرشتہ اس کے تعاقب میں ہو۔

چشتی صاحب 'دادا جی...... دادا جی......' کرتے رہ گئے لیکن دادا جی کا عصا نہ رُکا۔

اگلا وار گنجے والا پر ہوا تھا۔ لاٹھی گنجے والا کی چندیا پر پڑی تھی۔ گنجے والا 'ہائے اللہ!' کہہ کر لمبا لیٹ گیا تھا۔ شاید وہ ہوش و حواس کھو بیٹھا تھا۔ اس کے گنجے سر پر ایک اور ننھا سا سر نمودار ہو چکا تھا۔

اب دادا جی نے لاٹھی گھما کر مبارکاں پر وار کیا، وہ بروقت نیچے بیٹھ گیا اور لاٹھی دادا بڈی کی پسلیوں پر پڑی۔ دادا بڈی کی چیخ فلک شگاف تھی لیکن بکرے کی ماں کب تک خیر مناتی؟ اگلی بار لاٹھی مبارکاں کے پیٹ میں اتنے زور سے پڑی تھی کہ اسے اپنا سانس رُکتا ہوا محسوس ہوا تھا۔ اس کے منہ سے عجیب و غریب قسم کی آواز نکلی تھی اور وہ گر کر بے ہوش ہو گیا تھا۔

اب دادا جی نے چھوٹے والا کو گھور کر دیکھا کیونکہ اب میدان میں صرف وہی باقی بچا تھا۔ چھوٹے والا کا رنگ زرد پڑ گیا تھا۔ اس نے پچھلے دروازے سے بھاگنے کی کوشش کی لیکن دادا جی کا ٹھینگا سر پر! ان کی لاٹھی یکے بعد دیگرے حرکت میں آئی اور چھوٹے والا کی دونوں ٹانگوں نے اس کا وزن اُٹھانے سے انکار کر دیا۔ وہ بھی دھڑام سے گرا اور 'شہیدوں' میں شامل ہو گیا۔

اور تو اور...... انہوں نے چشتی صاحب کو بھی نہ بخشا تھا۔ چشتی صاحب شوکیس کے قریب کھڑے تھے، لہٰذا دادا جی نے عصا گھما کر پورے زور سے پھینک مارا۔ چشتی صاحب فوراً زمین پر جھکے لیکن عصا ان کی پیٹھ کی خبر لیتا ہوا شوکیس کے شیشے سے جا ٹکرایا اور شیشہ ایک دھماکے سے ٹوٹ گیا۔

سب لوگ لمبے لیٹے نظر آئے۔ کیا پتا، جھوٹ موٹ ہی بے ہوش پڑے ہوں۔

دادا جی نے ایک فاتحانہ نظر 'میدانِ کارزار' پر ڈالی، اپنا عصا ٹوٹے ہوئے شوکیس سے نکالا اور بُرا سا منہ بنا کر یہ کہتے ہوئے چل دیے: ''اونہہ...... سبھی بودے نکلے...... ارے، اس سے زیادہ مار تو جوانی میں ہم اپنی بیگم صاحبہ سے کھایا کرتے تھے...... مگر مجال ہے جو کبھی زمین چاٹی ہو......!''

☆☆☆

جمائی اور ہچکی

انسان اس وقت جمائی لیتا ہے جب وہ تھک جاتا ہے۔ تب اس کے جسمانی افعال میں سستی کا جسمانی ردِعمل ہوتا ہے۔ جسم کے اندر پٹھوں میں جو فالتو اور فاضل مواد بنتا ہے ان میں ایک کو کاربن ڈائی آکسائیڈ کہتے ہیں۔ جب جسم میں اس کی مقدار بڑھ جاتی ہے تو تھکن کا احساس غالب آ جاتا ہے اور انسان جمائی لیتا ہے اور منہ کھولتا ہے تاکہ اس کے ذریعے زیادہ سے زیادہ ہوا جسم کے اندر لے جا سکے۔ پھر سانس باہر نکالتا ہے جس میں کاربن ڈائی آکسائیڈ کی کافی مقدار شامل ہوتی ہے یہ سب کام خود بخود ہوتے ہیں کیوں کہ ہمارے دماغ کا ایک خاص حصہ ہے جو سوئچ بورڈ کی طرح کام کرتے ہوئے ایسے پیغامات بھیجتا ہے جن کا تعلق کاربن ڈائی آکسائیڈ کی کمی بیشی اور اخراج استعمال سے ہوتا ہے، دماغ میں کاربن ڈائی آکسائیڈ کی مقدار بڑھنے سے ہی دماغ کا ایمرجنسی سوئچ کام کرنے لگتا ہے اور ایسے تمام مسلز کو پیغام بھیجتا ہے جو جمائی لینے کے کام آتا ہے۔ جب کہ بعض اوقات انسان اس وقت بھی جمائی لیتا ہے جب دوسرے لوگ ایسا کرتے ہیں۔

اسی طرح ہچکی لینے کا عمل بھی دماغ کے پیغامات سے ہی تعلق رکھتا ہے، ہمارے سانس لینے کے متعلق دماغ جو احکامات جاری کرتا ہے وہ جب ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتے ہیں تو ہچکی آنے لگتی ہے۔ مثال کے طور پر اگر آپ ٹھنڈا یخ پانی پی لیں تو اس سے معدے میں گڑبڑ ہو سکتی ہے۔ ہمارا معدہ مسلز کی ایک بڑی شیٹ کے قریب ہوتا ہے جسے حجاب حاجز کہتے ہیں جو پھیپھڑوں میں بھی پمپنگ بھی مدد کرتی ہے۔ جب یہ مسلز ہوا اندر کو لینے کو تیار ہوتے ہیں عین اسی لمحہ ایک اور عمل شروع ہو جاتا ہے کہ ایک غلط پیغام ہمارے گلے میں واقع ایک چھوٹے سے فلیپ میں پہنچتا ہے اور یہ فلیپ ہوا کے اندر آنے کا راستہ بند کر دیتا ہے۔ اب ہمارے پھیپھڑوں میں کوئی ہوا اندر نہیں جا سکتی دماغ کی طرف سے غلط پیغامات کی وجہ سے مسلز کے دو سیٹس ایک ساتھ کام کرنے کی بجائے ایک دوسرے کے خلاف کام کرنے لگتے ہیں۔ مسلز کی بڑی شیٹ جھٹکا دیتی ہے۔ گلے کے بند فلیپ اور اس جھٹکے (Jerk) کی وجہ سے ہمیں ہچکی آنے لگتی ہے عام حالات میں تھوڑی دیر کے بعد خود بخود ٹھیک ہو جاتی ہے خاص طور پر اس وقت جب انسان کی توجہ کہیں اور مبذول ہو جائے۔

انسپکٹر (چور سے): "تم نے بڑی دلیری سے گھر کی دیوار پھلانگی، بڑی آسانی سے زیور چرایا اور بغیر آہٹ پیدا کیے رفو چکر ہو گئے۔"
چور (شرماتے ہوئے): "جناب! اتنی تعریف کر کے شرمندہ تو نہ کریں۔"
(بنت فاطمہ، لاہور)

ڈاکو (مسافر سے): "رقم دو گے یا جان؟"
مسافر: "جان لے لو، رقم میرے بڑھاپے کا سہارا ہے۔"
(انعم بٹ، کراچی)

علی (احمد سے): "تمہارا سر گنجا کیوں ہو رہا ہے؟"
احمد: "بس فکر کی وجہ سے ایسا ہو رہا ہے۔"
علی: "تمہیں کس بات کی فکر ہے؟"
احمد: "سر گنجا ہونے کی۔"
(سید عبداللہ ارشد)

ایک بچہ 5 منٹ میں پرچہ دے کر اُٹھ گیا۔
اُستاد: "پرچہ نہیں آتا کیا؟"
لڑکا: "نہیں...... ایسی کوئی بات نہیں، دراصل مجھے اگلے پرچے کی تیاری کرنی ہے۔"
(مائدہ رزاق، وزیر آباد)

جج نے ایک چور سے پوچھا: "تم نے دُکان کے شوکیس سے قیمتی ہار چوری کیوں کیا؟"
چور نے جواب دیا: "وہاں سے گزر رہا تھا، دُکان پر لکھا تھا ایسا سنہری موقع پھر نہیں آئے گا۔"

☆

ایک چور ایک بے وقوف کا موبائل لے کر بھاگا تو وہ بے وقوف ہنسنے لگا۔ یہ دیکھ کر اس کا دوست بولا: "وہ تمہارا موبائل لے گیا اور تم ہنس رہے ہو۔" "بے وقوف چور موبائل لے گیا تو کیا ہوا، چارج کیسے کرے گا۔"
(محمد سلیمان، دہوا)

اُستاد (شاگرد سے): "سب کے سوال درست ہیں، مگر یہ دو غلط کیوں؟"
شاگرد: "جناب! یہ دو سوال میں نے خود حل کیے ہیں۔"
(افراء محمود، بورے والا)

شاگرد: "کیا ہمیں اس بات پر مار پڑ سکتی ہے جو ہم نے نہ کی ہو۔"
اُستاد: "نہیں۔"
شاگرد: "شکر ہے آج میں نے گھر کا کام نہیں کیا۔"

☆

ابو: "بیٹے! آج تمہارا دن کیسا رہا؟"
بیٹا: "بہت اچھا! آج دن میں ٹاپ پر رہا ہوں۔"
ابو: "وہ کیسے؟"
بیٹا: "وہ ایسے کہ آج میں پورا دن کرسی پر کھڑا رہا ہوں اور ٹاپ پر تھا۔"
(عائشہ ملک، اٹک)

ایک صاحب گھبرائے ہوئے ڈاکٹر کے کلینک میں داخل ہوئے اور بولے: "ڈاکٹر صاحب، اگر ہچکیاں کسی صورت نہ رُکیں تو کیا کرنا چاہیے۔" ڈاکٹر نے اس کے منہ پر ایک زوردار تھپڑ مارا۔ جب ان صاحب کے اوسان بحال ہوئے تو ڈاکٹر نے کہا: "ہچکیاں نہ رُکنے کی صورت میں یہی کرنا چاہیے" وہ صاحب بولے: "ہچکیاں مجھے نہیں، میرے بھائی کو آ رہی ہیں۔"
(اقصیٰ نور)

ایک دیوار پر لکھا تھا: "گدھا کوڑا پھینک رہا ہے۔" ایک آدمی نے وہاں کوڑا پھینکا اور مسکراتے ہوئے بولا: "کوڑا میں نے پھینکا نام گدھے کا لگا۔"

☆

ڈاکٹر: "آپ کے چار دانت کیسے ٹوٹ گئے؟"
مریض: "بیوی نے سخت روٹی پکائی تھی۔"
ڈاکٹر: "کھانے سے انکار کر دیتے۔"
مریض: "یہی تو کیا تھا۔"
(حرا سعید شاہ، جوہر آباد)

ڈاکٹر نے نیا کلینک کھولا کچھ دیر بعد ایک آدمی آیا، ڈاکٹر نے اپنے آپ کو مصروف ظاہر کرنے کے لیے فون کان سے لگایا اور کسی سے بات کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد آدمی سے بولا: "جی، کیا کام ہے؟"
آدمی: "جی میں پی ٹی سی ایل سے آیا ہوں، آپ کا فون چالو کرنے۔"
(منیبہ عارف، عالیہ عارف، ڈسکوٹ)

میری زندگی کے مقاصد

مہا فاطمہ، اسلام آباد

میں ڈاکٹر بنوں گی اور اپنے ماں باپ کا نام روشن کروں گی۔

محمد ریان، اسلام آباد

میں آرمی آفیسر بن کر ملک کی حفاظت کروں گا۔

آمنہ عمران، لاہور

میں عالمہ بن کر دینِ اسلام کی خدمت کروں گی۔

چوہدری سلطان، ملتان

میں ڈاکٹر بن کر ملک و قوم کی خدمت کروں گا۔

محمد حاشر، لاہور

میں حافظِ قرآن بنوں گا اور ڈاکٹر بن کر ملک و قوم کی خدمت کروں گا۔

حسن عبداللہ، لاہور

میں انجینئر بنوں گا اور ملک کی خدمت کروں گا۔

نعمان حیدر، لاہور

میں بڑا ہو کر کمانڈو بنوں گا۔

محمد تمیم داری، بھوآنہ

میں بڑا ہو کر آرمی آفیسر بنوں گا۔

محمد الریان، گجرات

میں آرمی جوائن کر کے ملک و قوم کی خدمت کروں گا اور حافظِ قرآن بھی بنوں گا۔

حمزہ اکرم، جہلم

میں ڈاکٹر بن کر غریبوں کا مفت علاج کروں گا۔

محمد عدنان، کراچی

میں فوجی بن کر ملک و قوم کی حفاظت کروں گا۔

عبدالرحیم، بھیرمل

میں پڑھ لکھ کر انجینئر بنوں گا۔

عشنا شکیل احمد، لاہور

میں ڈاکٹر بن کر ماں باپ، ملک و قوم کا نام روشن کروں گی اور غریبوں کا مفت علاج کروں گی۔

سیدہ فاطمہ، فیصل آباد

میں آرمی آفیسر بن کر ملک کی حفاظت کروں گی۔

افتخار احمد، کراچی

میں فوجی بن کر اپنے ملک کی حفاظت کروں گا۔

محمد عبداللہ، کراچی

میں فوجی بن کر وطنِ عزیز کو دہشت گردوں سے پاک کروں گا۔

عمر اشرف غوری، اسلام آباد

میں ایک اچھا انسان اور آرٹسٹ بنوں گا۔

جویریہ جلیل، راول پنڈی

میں ڈاکٹر بن کر ملک و قوم کی خدمت کروں گی۔

عبادالرحمٰن، کراچی

میں فوجی بن کر ملکی سرحدوں کی حفاظت کروں گا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

مختصر مختصر

حمد

اللہ تو ہے قدرت والا
تیری حکمت کیا کوئی پائے
حسیں پرندے اور چوپائے
سورج سے دُنیا چمکائی
ٹہنی ٹہنی پھل لٹکائے
تیری قدرت کے نظارے
تیرا شکر ادا کرتے ہیں

سارے عالم کا رکھوالا
کہیں پہ دھوپ، کہیں پہ سائے
تو نے دُنیا میں پھیلائے
کالی کالی رات بنائی
گلشن گلشن پھول کھلائے
پربت، میداں، بہتے دھارے
ہر دم تیرا دم بھرتے ہیں

(سعید مقصود، معاذ ولی ساجد)

بدلتا موسم

موسم بدل رہا ہے بچو!
ابھی نہ ٹھنڈا پانی پینا
یوں تو گلا خراب بھی ہو گا
اک پل بھی پھر آرام نہ ہو گا
بُرے ہرگز امتحان نہ ہوں
لازم ہے احتیاط برتنا
بچو! ماں باپ کا کہنا مانو

لازم ہے احتیاط تم برتو
نہ ہی برف کے گولے کھانا
ساتھ زکام، بخار بھی ہو گا
پڑھائی کا نقصان بھی ہو گا
امی، ابو پریشان نہ ہوں
اپنے بڑوں کی بات سمجھنا
اپنے بڑوں کی قدر پہچانو

(مشکوٰۃ المصابیح)

اپریل فول

انگریزوں کی ہے یہ بھول
یہ بات تم سچ کر دکھاؤ
انگریزوں کا ہے یہ تہوار
دھوکہ کبھی تم کسی کو نہ دو
دھوکے سے ہوتا ہے نقصان
اپریل فول نہیں منانا ہے

منائیں گے مسلم اپریل فول
اپریل فول کبھی نہ مناؤ
انگریز ہی منائیں گے اس کو یار
بچے پکے تم مسلم ہو
اکثر جل جاتے ہیں مکان
اپنا دین بچانا ہے

(محمد طلحہ صفدر، ملتان)

علم بکاؤ چیز نہیں

صدیوں پہلے ایک بہت بڑے عالم شیخ ابو العباسؒ گزرے ہیں۔ ایک دفعہ وہ ایک دُکان پر اخروٹ خریدنے گئے۔ دُکان دار نے اپنے ملازم سے کہا: ''اچھے اچھے اخروٹ چن کر دینا۔'' شیخ ابو العباسؒ نے دُکان دار سے پوچھا: ''کوئی بھی شخص اخروٹ خریدنے آتا ہے تو کیا تم اپنے ملازم کو ہمیشہ یہی حکم دیتے ہو کہ اچھے اچھے اخروٹ چن کر دینا؟'' دُکان دار نے کہا: ''نہیں، یہ حکم تو میں نے اسے آپ کے علم کی وجہ سے دیا ہے۔'' شیخ ابو العباسؒ نے یہ سن کر فرمایا: ''بھائی! میں چند اخروٹوں کے عوض اپنا علم نہیں بیچ سکتا۔'' یہ فرما کر وہ اخروٹ خریدے بغیر چلے گئے۔

(حافظ محمد فرخ حیات، پیرمحل)

اقوال شیخ سعدیؒ

☆ اللہ کا راستہ اس کی توفیق سے ملتا ہے۔
☆ چاہے ذلت اُٹھانی پڑے اپنی غلطی تسلیم کرنی چاہیے۔
☆ اچھا خواب اللہ کی طرف سے ہے اور بُرا شیطان کی طرف سے۔
☆ مالک کو اپنے بوجھ کی فکر ہوتی ہے، گدھے کے زخم کی نہیں۔
☆ احساس کیا ہے؟ دوسروں کی تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھنا۔
☆ ہر شے کا ایک حُسن ہے۔ نیکی کا حُسن یہ ہے کہ فوراً کی جائے۔
☆ بد اخلاقی نجاستِ باطنی کی دلیل ہے۔
☆ کسی کا دل نہ دُکھاؤ، تم بھی دل رکھتے ہو۔
☆ آدمی کی رسائی خدا تک تب ہوتی ہے جب اس کا نفس مر جاتا ہے۔
☆ اس کی ہمت کے کیا کہنے جو نیک کام اخلاص سے کرتا ہے۔

(ثمرہ احمد، ڈسکہ سیال کوٹ)

انسان

انسان نے کوئل سے کہا: ''اگر تم کالی نہ ہوتی تو کتنا اچھا ہوتا۔'' پھر سمندر سے کہا: ''اگر تو گہرا نہ ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا۔'' پھر گلاب سے کہا: ''اگر تمہارے اوپر کانٹے نہ ہوتے تو کتنا اچھا ہوتا۔'' تب تینوں نے مل کر کہا: ''اے ابن آدم! اگر تجھ میں دوسروں کے عیب نکالنے کی عادت نہ ہوتی تو کتنا اچھا ہوتا۔''

(ریشا نور، اسلام آباد)

اقوالِ زریں امام مالکؒ

☆ زیادہ مت ہنسو، زیادہ ہنسنا بے وقوفی کی علامت ہے۔
☆ ناپسندیدہ باتوں سے چشم پوشی کرو اور بردباری سے کام لو۔
☆ بے وجہ مزاح نہ کرو اس سے ذلیل ہو جاؤ گے۔
☆ ظالم کا ہاتھ پکڑو اور اسے ظلم سے روکو۔ (ہمایوں رشید، اسلام آباد)

اقوالِ زریں

☆ ماں کی بددُعا سے بچو کیوں کہ یہ بغیر رکاوٹ کے خدا کے پاس جاتی ہے۔
☆ اگر تم کسی کو خوشی نہیں دے سکتے تو غم بھی نہ دو۔
☆ سب کچھ مل جاتا ہے مگر ماں باپ نہیں ملتے۔
☆ خاموشی دل کا سکون ہے اور روح کے لیے وہی درجہ رکھتی ہے جیسے جسم کے لیے نیند۔
☆ اللہ تعالیٰ کی راہ میں گن گن کر خرچ نہ کرو ورنہ خدا بھی تمہیں گن گن کر دے گا۔
☆ جس دل میں والدین کی اطاعت اور احترام ہو، اس پر رزق کبھی تنگ نہیں ہوتا۔
☆ راز کو راز میں رکھنا بڑی ذہانت اور عقل مندی ہے لیکن یہ اُمید رکھنا کہ دوسرے بھی اس کو راز رکھیں گے، سب سے بڑی بے وقوفی ہے۔
☆ مشکلات کا مقابلہ کرنے کا نام زندگی ہے اور ان پر غالب آ جانے کا نام کام یابی ہے۔ (محمد حنظلہ سعید، فیصل آباد)

علم کی فضیلت

☆ انسان کی سب سے بڑی فضیلت علم ہے، یہ ساکن نہیں رواں دواں ہے۔ ایمان اور علم لازم وملزوم ہے۔ (امام غزالیؒ)
☆ جس طرح خوراک، لباس اور رہائش وغیرہ کا حصول انسانی ضروریات کا تقاضا ہے، اسی طرح حصولِ علم بھی فطرت انسانی کا تقاضا ہے۔ (ابن خلدون)
☆ علم کا مقصد رضائے الٰہی کا حصول ہے۔ سب سے پہلے اور سب سے آخر میں خداوند تعالیٰ کو یاد رکھا جائے۔ (ابن سینا)
☆ وہ شخص بدنصیب ہے جو اس مقصد کے لیے علم حاصل کرے کہ لوگ اس کی عزت کریں اور تحفے تحائف پیش کریں۔ (علامہ زرنوجی)
(مرسلہ: کشف طاہر، گوجرانوالہ)

مہکتی کلیاں

☆ جلد سے جلد تجربہ کار ہونے کے لیے ایک اصول یاد رکھیں۔ زبان بند مگر آنکھیں اور کان کھلے رکھیں۔
☆ مشکلات کو دُور کرنے، خواہشات کو دبانے اور تکالیف برداشت کرنے سے انسان کا کردار مضبوط اور پاکیزہ ہوتا ہے۔
☆ محتاط لوگ عموماً کم غلطیاں کرتے ہیں۔
☆ خامیوں کا احساس کام یابی کی کنجی ہے۔
☆ احسان کی خوبی اس کے نہ جتلانے پر منحصر ہے۔
☆ کانٹوں سے بھری ہوئی ٹہنی کو ایک پھول پُرکشش بنا دیتا ہے۔
☆ محنتی کے سامنے پہاڑ کنکر ہیں اور کاہل کے سامنے کنکر پہاڑ۔
(رجبہ ثاقب محمود، پنڈ دادن خان)

انمول موتی

☆ شروع کرنا تیرا کام ہے اور تکمیل کرنا اللہ کا کام ہے۔
☆ قیامت کے روز غریب ہمسایہ دامن گیر ہوگا۔
☆ توکل کرنا مومنوں کا فرض ہے اور اللہ ان کی مدد یقیناً کرتا ہے۔
☆ ہمیشہ نیک لوگوں کی صحبت اختیار کرو۔ (کشف نور)

قیمتی موتی

☆ گفتگو ایسی چیز ہے جس کی وجہ سے انسان یا تو دل میں اُتر جاتا ہے یا پھر دل سے اُتر جاتا ہے۔
☆ عادت ایک ایسی زنجیر ہے جو دیکھنے میں چھوٹی نظر آتی ہے مگر عمر بھر نہیں ٹوٹتی۔
☆ دُنیا میں آنے والا ہر وجود اپنی الگ قسمت اور مقدر رکھتا ہے۔
☆ کوئی زنجیر اپنی کڑیوں سے زیادہ مضبوط نہیں ہوسکتی۔
☆ آدھے غم انسان دوسروں سے اُمیدیں وابستہ کر کے خریدتا ہے۔
☆ سفر کرنے سے پہلے ساتھی اور گھر خریدنے سے پہلے پڑوسی کو دیکھو۔
☆ زندگی کو شکست کی نگاہوں سے دیکھو تاکہ جیت کے معنی سمجھ سکو۔

کثرت رزق کے 10 اسباب

☆ استغفار کرنا۔ (سورۃ نوح: 10, 11, 12)
☆ تقویٰ اختیار کرنا۔ (سورۃ الطلاق: 2, 3)
☆ اللہ کی ذات پر توکل کرنا۔ (مسند احمد بن حنبل: 205)
☆ حسبِ حیثیت صدقہ خیرات کرنا۔ (سورۃ سبا: 39)
☆ شکر کرنا۔ (سورۃ ابراہیم: 7)
☆ صلہ رحمی کرنا۔ (صحیح بخاری: 5986)
☆ پاک دامنی کے لیے شادی کرنا۔ (سنن النسائی: 3218)
☆ لگاتار حج وعمرہ کرنا۔ (سنن الترمذی: 810)
☆ گناہوں کو چھوڑ دینا۔ (سنن ابن ماجہ: 4022)
☆ صبح سویرے رزق کی تلاش میں نکلنا۔ (سنن ابی داؤد)
(اسامہ بن طاہر، لاہور)

ڈیزی

ڈیزی "Daisy" یا ''گل معصوم'' کو اپریل کا پھول (Flower of April) کہا جاتا ہے۔ اس پودے کا سائنسی نام

"Bellis Perennis" ہے جس کا تعلق "Asteraceae" خاندان سے ہے۔ یہ یورپ کا مقامی پھول ہے۔ اس کے پتے 2 انچ (5-2 سینٹی میٹر) لمبے اور چپٹے ہوتے ہیں۔ پھول کے وسط میں فلاور ہیڈ (Flower Head) پر کئی چھوٹے چھوٹے پھول (Florets) لگے ہوتے ہیں جو 2 سے 3 سینٹی میٹر پر لگے ہوتے ہیں۔ 25 سے 30 سینٹی گریڈ ان کے لیے عمدہ درجۂ حرارت ہے۔ پھول کا رنگ سرخ، سفید یا گلابی ہوتا ہے۔ ڈیزی پودے کے پتے بطور سلاد بھی استعمال ہوتے ہیں جبکہ پھول، صابن اور سلاد وغیرہ میں بھی استعمال ہوتے ہیں۔ پُرانے زمانے میں ڈیزی پھول کے عرق میں پٹیاں ڈبو کر زخموں پر باندھی جاتی تھیں کیوں کہ ان کے عرق میں زخموں کو بھرنے میں مدد دینے کی صلاحیت پائی جاتی ہے۔ ''ڈیزی'' نام کی فلمیں، ڈرامے، ناول اور قصے کہانیاں بھی مشہور ہیں۔

انوفیلیز

انوفیلیز (Anopheles) ایک مادہ مچھر ہے جس کے کاٹنے سے پلازموڈیم جرثومہ انسانی خون میں شامل ہو جاتا ہے جو ملیریا کا باعث بنتا ہے۔ دنیا میں ورلڈ ملیریا ڈے (World Malaria Day) ہر سال 25 اپریل کو منایا جاتا ہے۔ انوفیلیز مچھر کو 1818ء میں "J.W.Meigen" نے پہلی بار بیان کیا۔ اس مچھر کی 460

اقسام ہیں جن میں سے 100 اقسام ملیریا پھیلاتے ہیں۔ یونانی زبان میں انوفیلیز کا لفظی مطلب ہے ''بیکار'' (Useless)۔ یہ مادہ مچھر پانی میں 50 سے 200 تک ایک وقت میں انڈے دیتی ہے جن کا سائز 0.2X0.5 ملی میٹر تک ہوتا ہے۔ انڈہ، لاروا، پیوپا اور امیگو (Imago) کے مراحل سے گزر کر انوفیلیز پیدا ہوتی ہے۔ نر (Male) مچھر پھولوں وغیرہ کا رس پی کر گزارہ کر لیتا ہے جب کہ مادہ مچھر کو انڈے دینے کے لیے آئرن کی ضرورت ہوتی ہے جو انسانی خون میں ہیموگلوبن پروٹین میں پایا جاتا ہے۔ ملیریا سے ہر

سال ہزاروں لوگ ہلاک ہو جاتے ہیں۔

ڈاکٹر عبدالقدیر خاں

پاکستان کے مایہ ناز ایٹمی سائنس دان ڈاکٹر عبدالقدیر خاں یکم اپریل 1936ء کو بھارتی ریاست بھوپال میں پیدا ہوئے۔ آپ کو محسنِ پاکستان کہا جاتا ہے۔ آپ کی والدہ کا نام زلیخا اور والد کا نام عبدالغفور خاں تھا۔ ہجرت کے بعد آپ کا خاندان کراچی آ کر آباد

ہوا۔ کراچی یونیورسٹی سے فزکس میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد کراچی سے جرمنی روانہ ہوئے اور برلن یونیورسٹی سے میٹالرجی (Metallurgy) میں تعلیم شروع کی اور بعدازاں بلجیئم چلے گئے اور پی ایچ ڈی مکمل کی۔ تحقیقی سفر کا آغاز ہالینڈ (ایمسٹرڈم) سے کیا۔ سابق وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کی خواہش پر پاکستان میں ایٹمی پروگرام پر عمل کیا۔ مختلف سائنس دانوں نے مل کر وطنِ عزیز کو ایٹمی طاقت بنانے میں کردار ادا کیا۔ 28 مئی 1998ء کو وزیراعظم میاں نواز شریف کے حکم پر ایٹمی دھماکے کر کے پاکستان ایٹمی طاقت بن گیا۔ ڈاکٹر عبدالقدیر خاں کی شادی ہنی خاں سے ہوئی۔ 14 اگست 1996ء کو سابق صدرِ پاکستان فاروق احمد لغاری نے سب سے بڑا سول اعزاز نشان امتیاز دیا۔ ڈاکٹر صاحب کی ہالینڈ نژاد بیگم سے دو لڑکیاں ہیں۔ ڈاکٹر صاحب آج کل ایک اسپتال کی تعمیر میں مصروف ہیں۔

ای سی جی

انسانی دل کی کارکردگی کو جانچنے کے لیے ای سی جی (ECG) کی جاتی ہے۔ ECG (Electro Cardio Graphy) کا مخفف ہے جو ای سی جی مشین سے کی جاتی ہے۔ ای سی جی یا برقی

قلبی تخطیط مشین کی مدد سے دل کی دھڑکن، اس کی رفتار اور کارکردگی کو ریکارڈ کیا جاتا ہے۔ متاثرہ شخص کے بازو، سینے وغیرہ پر الیکٹروڈز (Electrodes) لگا دیئے جاتے ہیں جو برقی سگنل کو ایک کاغذ پر منتقل کر دیتے ہیں۔ جو دل کی دھڑکن کا ریکارڈ ظاہر کرتی ہے۔ یہ ریکارڈ ایک گراف نما پیپر کاغذ پر تیار ہوتا ہے۔ یہ کاغذ سرخ یا سبز ہوتا ہے۔ وقت کو X-axis اور وولٹیج کو Y-axis پر ظاہر کیا جاتا ہے۔ ای سی جی مشین بنانے کی ابتداء 1872ء سے شروع ہوئی، تاہم 1901ء میں ہالینڈ کے سائنس دان Willeum Einthoven نے بہترین مشین بنانے میں کام یابی حاصل کی اور 1924ء میں ای سی جی مشین بنانے پر نوبل ایوارڈ حاصل کیا۔ ☆☆☆

آزادی

ہے کس کی یہ جرأت کہ مسلمان کو ٹوکے
حُرّیتِ افکار کی نعمت ہے خدا داد
چاہے تو کرلے کعبے کو آتش کدۂ پارس
چاہے تو کرلے اس میں فرنگی صنم آباد
قرآن کو بازیچۂ تاویل بنا کر
چاہے تو خود اک تازہ شریعت کرے ایجاد
ہے مملکتِ ہند میں اک طرفہ تماشا
اسلام ہے محبوس، مسلمان ہے آزاد!

(علامہ اقبال: ضربِ کلیم)

اوجھل خاکے
Crayon
Crayon
یہ چیزیں خاکے میں چھپی ہوئی ہیں۔ آپ ان چیزوں کو تلاش کیجیے اور شاباش لیجیے۔

درج ذیل دیے گئے جوابات میں سے درست جواب کا انتخاب کریں۔

1۔ اللہ کی بنائی ہوئی کس مخلوق کا خون سفید ہوتا ہے؟

i۔ مچھر ii۔ لال بیگ iii۔ مکھی

2۔ ہجرت حبشہ کے موقع پر شاہ نجاشی کے دربار میں کس سورۃ کی تلاوت کی گئی؟

i۔ سورۃ المریم ii۔ سورۃ الکوثر iii۔ سورۃ الناس

3۔ اس شعر کا دوسرا مصرع بتایئے:

گلوں میں رنگ بھرے بادِ نو بہار چلے ....

4۔ قرآنِ پاک کی سب سے آخری سورت کون سی ہے؟

i۔ سورۃ الفلق ii۔ سورۃ الکوثر iii۔ سورۃ الناس

5۔ ''فِضّہ'' عربی زبان میں کس کو کہتے ہیں؟

i۔ سونا ii۔ چاندی iii۔ تانبا

6۔ بلندی کی پیمائش کس آلے سے کی جاتی ہے؟

i۔ کلوکومیٹر ii۔ تھرمامیٹر iii۔ آلٹی میٹر

7۔ آبی شیشے کا کیمیائی نام کیا ہے؟

i۔ سوڈیم سلفائیڈ ii۔ سوڈیم سیلیکیٹ iii۔ سوڈیم کلورائیڈ

8۔ دُنیا کا وہ کون سا واحد براعظم ہے جس میں کوئی ملک واقع نہیں؟

i۔ شمالی امریکہ ii۔ انٹارکٹیکا iii۔ اوشیانا

9۔ علامہ اقبالؒ کی نظم ''سیّد کی لوحِ تربت'' سر سیّد احمد خان پر لکھی گئی ہے، بتایئے سر سیّد احمد خاں کب پیدا ہوئے؟

i۔ 1817ء ii۔ 1818ء iii۔ 1819ء

10۔ علامہ اقبالؒ کے مزار کا نقشہ کس نے بنایا؟

i۔ عبدالرحمان چغتائی ii۔ زین یار جنگ iii۔ صادقین

جوابات علمی آزمائش مارچ 2015ء

1۔ کانسی 2۔ مینار پاکستان 3۔ دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں 4۔ بحر منجمد شمالی 5۔ سلفیورک ایسڈ 6۔ بریانی اور نہاری 7۔ مکہ 8۔ محمود غزنوی 9۔ سنگاپور 10۔ بھرتری ہری

اس ماہ بے شمار ساتھیوں کے درست حل موصول ہوئے۔ ان میں سے 3 ساتھیوں کو بذریعہ قرعہ اندازی انعامات دیے جا رہے ہیں۔

☆ عروج نوید، لاہور (150 روپے کی کتب)

☆ زونیرا ہارون، نوشہرہ (100 روپے کی کتب)

☆ عبدالخبیر، کراچی (90 روپے کی کتب)

دماغ لڑاؤ سلسلے میں حصہ لینے والے کچھ بچوں کے نام بہ ذریعہ قرعہ اندازی: محمد قمر الزمان صائم، خوشاب۔ عزت مسعود، فیصل آباد۔ مزمل آصف خان، عمر تنویر، حمزہ ارشاد، فراز علی، محمد بشارت، محمد اسامہ، کراچی۔ مقدس چوہدری، راول پنڈی۔ آمنہ سلام، اسلام آباد۔ زینب خان، پشاور۔ مرزا ہادی بیگ، حیدر آباد۔ ضحیٰ تجمل، لاہور۔ محمد احمد خان غوری، بہاول پور۔ آمنہ عمران، لاہور۔ انیقہ فجر ظفر قریشی، میر پور۔ اقراء یعقوب، الہ آباد۔ آفاق، کراچی۔ مشیرہ سلیمان بٹ، گوجرانوالہ۔ طوبیٰ بن راشد، لاہور۔ عارفہ عزیز، حیدر آباد۔ مائرہ حنیف، بہاول پور۔ میر محمد موسیٰ، کراچی۔ عائشہ آصف، واہ کینٹ۔ ماہ نور طاہر، اٹک۔ محمد عثمان، بہاول پور۔ ارینا آفتاب، کراچی۔ لیلیٰ جلیل، نوشہرہ۔ اذکیٰ آصف، پشاور۔ عائشہ طاہر، پشاور۔ عبدالرحمٰن ندیم، گوجرانوالہ۔ محمد حاشر، لاہور۔ عبدالرحمٰن بٹ، سیال کوٹ۔ محمد عرفان آفریدی، پشاور۔ شہزادی خدیجہ شفیق، لاہور۔ محمد روشن علی، ساہی وال۔ محمد ریحان اصغر، مظفر گڑھ۔ ثمن شہزادی قادری، محمد ندیم قادری، محمد نعمان قادری، صدام حسین قادری، نور حسین قادری، نفیسہ فاطمہ قادری، نور فاطمہ قادری، خدیجہ شان، محمد عمر عطا قادری، حلیمہ نشان، حسن رضا سردار، کاموکی۔ احور کامران رانا، کظیمہ زہرہ، بثین، ظلال، ساہی وال۔ نور فاطمہ، لاہور۔ صالحہ کاردار، صائمہ کاردار، نوشہرہ۔ روحی اصغر، کشور ملک، بشریٰ ناز، ملتان۔ نادر، زاہرہ، شکیلا بی بی، اسماء ندیم، سیال کوٹ۔ احمد عدنان، فیصل آباد۔ حفصہ نور، وردہ زاہرہ، لاہور۔ ام کلثوم، محمودہ سلطانہ، نازیہ پروین، داؤد خان، ڈیرہ غازی خان۔ بجیلا ناز، طوبیٰ خان، کوئٹہ۔ شمیم ناز، نسیم سحر، منچن آباد۔ احمد علی، ندیم خان، پشاور۔ سدرہ بانو، عامرہ محمود، لاہور۔ عرفانہ ناز، آمنہ محمود، صفیہ ناز، راول پنڈی۔ زمن ناز، رضیہ کلثوم، حاجرہ، خرم ندیم، ظل ہما، جمیل احمد، گجرات۔ جنید اکرم، حفیظ طاہر، ساحرہ بانو، عائشہ مجید، شازیہ گل، ملتان۔

محاورہ کہانی

دھوبی کا کتا نہ گھر کا نہ گھاٹ کا

زبیدہ سلطانہ

فضلو دھوبی نے جیسے ہی بیل پر سے دُھلے ہوئے کپڑوں کی لادی اُتار کر دالان میں رکھی، اس کا پالتو کتا موتی دم ہلاتا ہوا اس کے پیچھے پیچھے دالان میں چلا آیا۔ پھر صحن میں نکل کر اِدھر اُدھر کچھ سونگھنے اور کونے میں رکھے کوڑے کے کنستر میں منہ مارنے لگا۔ فضلو کی بیوی رانی دھوبن، موتی کی ان حرکتوں سے سمجھ گئی کہ وہ بہت بھوکا ہے۔

''دینو کے ابا! کیا تم نے دوپہر کو موتی کو روٹی نہیں ڈالی؟'' اس نے دھوبی سے پوچھا تو فضلو کچھ سوچ کر بولا:

''دوپہر کو میں نے جب روٹی کھائی تو موتی گھاٹ پر مجھے کہیں نظر نہیں آیا، میں نے سوچا گھر گیا ہوگا اور تم نے اسے روٹی ڈال دی ہوگی۔''

رانی فوراً اُٹھی اور باورچی خانے میں سے ڈھونڈ ڈھانڈ کر موتی کو بچا کھچا کھانا ڈالا۔ وہ بے صبری سے کھانے پر ٹوٹ پڑا۔ یہ دیکھ کر رانی کو اس پر بڑا ترس آیا اور اسے چمکار کر کہنے لگی:

''موتی! تو ہر روز بھوکا رہتا ہوگا، تبھی تیری پسلیاں نکل آئی ہیں۔ میں سمجھتی رہتی ہوں تو نے مالک کے ساتھ گھاٹ پر کھانا کھا لیا ہوگا اور دینو کا ابا سوچتا ہے تو گھر سے کھا آیا ہوگا۔ ہائے ہائے، بے چارا میرا موتی!''

ہمسائی دیوار سے جھانک کر یہ سب باتیں سن رہی تھی، ہنس کر بولی: ''اس کا تو یہ مطلب ہوا کہ بے چارا دھوبی کا کتا نہ گھر کا نہ گھاٹ کا۔''

بچو! جس کا کوئی ٹھکانہ نہ ہو، اس کے حال پر یہ مثل صادق آتی ہے کہ دھوبی کا کتا نہ گھر کا نہ گھاٹ کا۔ گویا نہ اِدھر کا رہا نہ اُدھر کا رہا۔ دونوں طرف سے نقصان میں رہنے والے آدمی کے متعلق یہ ضرب المثل کہی جاتی ہے۔ ☆☆☆

صوفی غلام مصطفیٰ تبسم

ٹوٹ بٹوٹ

ٹوٹ بٹوٹ کی موٹر کار

اس موٹر کی شان نرالی
دو سیٹوں، دو پہیوں والی
تین انجن اور ہارن چار
ٹوٹ بٹوٹ کی موٹر کار
ساتھ ہوا کے اُڑتی جائے
دائیں بائیں مُڑتی جائے
بڑی ہی سیانی بڑی ہشیار
ٹوٹ بٹوٹ کی موٹر کار

ہمارا دیس

دیس ہمارا پاکستان
دیس ہمارا ہم کو پیارا
ہم سب کی آنکھوں کا تارا
اپنے دیس پہ ہم قربان
دیس ہمارا پاکستان
اس کی خوشی آرام ہمارا
اس کے نام سے نام ہمارا
اس کی شان ہماری شان
دیس ہمارا پاکستان
آزادی ہے شان ہماری
آزادی میں آن ہماری
آزادی اپنا ایمان
دیس ہمارا پاکستان

بادل

کالے بادل آئیں گے
آ کر مینہ برسائیں گے
مینہ میں لوگ نہائیں گے
کالے بادل آئیں گے
مینہ برسے گا ٹپ ٹپ
ساز بجے گا ٹپ ٹپ
ہم ناچیں گے گائیں گے
کالے بادل آئیں گے

کبوترے

اک تھا [illegible] گرے
اس کے دو مور تھے
اک کا کالا تھا سر
اک کے پیلے تھے پَر
دانہ کھاتے تھے وہ
دم ہلاتے تھے وہ
شام کو دن ڈھلے
اپنے گھر سے چلے
تھے بڑی لہر میں
آ گئے شہر میں
کچھ وہاں سیر کی
کچھ یہاں سیر کی
ڑ ٹراتے ہوئے
گانا گاتے ہوئے

ٹوٹ بٹوٹ نے کھیر پکائی

خالہ اُس کی لکڑی لائی
پھوپھی لائی دیا سلائی
امی جان نے آگ جلائی
ٹوٹ بٹوٹ نے کھیر پکائی
دیگچی، چمچہ نوکر لائے
بھائی چاول شکر لائے
بہنیں لائیں دودھ ملائی
ٹوٹ بٹوٹ نے کھیر پکائی

مادام رتھ فاؤ: یہ خاتون جرمنی کے شہر لائزگ کی رہنے والی تھیں، پیشے کے لحاظ سے یہ ڈاکٹر تھیں۔ 1958ء کی بات ہے، اس خاتون نے تیس سال کی عمر میں پاکستان میں کوڑھ (جزام) کے مریضوں کے بارے میں ایک فلم دیکھی۔ کوڑھ چھوت مرض ہے جس میں مریض کا جسم گلنا شروع ہو جاتا ہے۔ جسم میں پیپ پڑ جاتی ہے اور اس کے ساتھ ہی انسان کا گوشت ٹوٹ ٹوٹ کر نیچے گرنے لگتا ہے۔ کوڑھی کے جسم سے شدید بو بھی آتی ہے۔ کوڑھی اپنے اعضاء کو بچانے کے لیے ہاتھوں، ٹانگوں اور منہ کو کپڑے کی بڑی بڑی پٹیوں میں لپیٹ کر رکھتے ہیں۔ یہ مرض لاعلاج سمجھا جاتا تھا، چنانچہ جس انسان کو کوڑھ لاحق ہو جاتا تھا وہ ویرانوں میں سسک سسک کر دم توڑ دیتا تھا۔ پاکستان میں 1960ء تک کوڑھ کے ہزاروں مریض موجود تھے۔ یہ مرض تیزی سے پھیل بھی رہا تھا۔ ملک کے مختلف مخیّر حضرات نے کوڑھیوں کے لیے شہر سے باہر رہائش گاہیں تعمیر کروا دی تھیں۔ یہ رہائش گاہیں کوڑھی احاطہ کہلاتی تھیں۔ لوگ آنکھ، منہ اور ناک لپیٹ کر ان احاطوں کے قریب سے گزرتے تھے۔ لوگ مریضوں کے لیے کھانا دیواروں کے باہر سے اندر پھینک دیتے تھے اور یہ بیچارے مٹی اور کیچڑ میں لتھڑی ہوئی روٹیاں جھاڑ کر کھا لیتے تھے۔ ملک کے تقریباً تمام شہروں میں کوڑھی احاطے تھے۔ پاکستان میں کوڑھ کو ناقابلِ علاج سمجھا جاتا تھا، چنانچہ کوڑھ یا جزام کے شکار مریض کے پاس دو آپشن ہوتے تھے یہ سسک کر جان دے دے یا خودکشی کر لے۔ مادام رتھ فاؤ انتہائی جاذب نظر اور توانائی سے بھرپور عورت تھی اور یہ یورپ کے شان دار ملک جرمنی کی شہری بھی تھیں۔ زندگی کی خوب صورتیاں ان کے راستے میں بکھری ہوئی تھیں لیکن اس نے اس وقت ایک عجیب فیصلہ کیا۔ یہ جرمنی سے کراچی آئی اور اس نے پاکستان میں کوڑھ کے مریضوں کے خلاف جہاد شروع کر دیا اور یہ اس کے بعد واپس نہیں گئی۔ اس نے پاکستان کے کوڑھیوں کے لیے اپنا ملک اپنی جوانی اپنا خاندان اور اپنی زندگی تیاگ دی۔ انہوں نے کراچی ریلوے اسٹیشن کے پیچھے میکلوڈ روڈ پر چھوٹا سا سینٹر بنایا اور کوڑھیوں کا علاج شروع کر دیا۔ اس کا جذبہ نیک اور نیت صاف تھی، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کے ہاتھ میں شفا دے دی۔ یہ مریضوں کا علاج کرتی اور کوڑھیوں کا کوڑھ ختم ہو جاتا۔ اس دوران آئی کے گل نے بھی انہیں جوائن کر لیا اور کراچی میں 1963ء میں میری لپریسی سینٹر بنایا اور مریضوں کی خدمت شروع کر دی۔ یہ سینٹر 1965ء تک اسپتال کی شکل اختیار کر گیا اور انہوں نے جزام کے خلاف آگاہی کے لیے سوشل ایکشن پروگرام شروع کیا۔ وہ پاکستان میں جزام کے سینٹر بناتی چلی گئیں یہاں تک کہ ان سینٹر کی تعداد 156 تک پہنچ گئی۔ ڈاکٹر نے اس دوران 60,000 مریضوں کو زندگی دی۔ یہ لوگ نہ صرف کوڑھ کے مرض سے صحت یاب ہو گئے بلکہ یہ عام انسانوں کی طرح زندگی بھی گزارنے لگے۔ حکومت نے 1988ء میں ان کو پاکستان کی شہریت دے دی۔ انہیں ہلالِ پاکستان، ستارہ قائداعظم، ہلالِ امتیاز اور جناح ایوارڈ بھی دیا گیا اور نشانِ قائداعظم سے بھی نوازا گیا۔ آغا خان یونیورسٹی نے انہیں ڈاکٹر آف سائنس کا ایوارڈ بھی دیا۔ جرمنی کی حکومت نے بھی انہیں آرڈر آف میرٹ سے نوازا۔ ڈاکٹر رتھ کا عین جوانی میں جرمنی سے پاکستان میں آ جانا اور اپنی زندگی اجنبی ملک کے ایسے مریضوں پر خرچ کر دینا جنہیں ان کے اپنے خونی رشتے دار بھی چھوڑ جاتے ہیں، واقعی کمال ہے۔ ہم مانیں یا نہ مانیں لیکن یہ حقیقت ہے یہ خاتون، اس کی ساتھی سسٹر بیرنس اور ڈاکٹر آئی کے گل پاکستان نہ آتے اور اپنی زندگی اور وسائل اس ملک میں خرچ نہ کرتے تو شاید ہمارے ملک کی سڑکوں اور گلیوں میں لاکھوں کوڑھی پھر رہے ہوتے اور دنیا نے ہم پر اپنے دروازے بند کر دیئے ہوتے۔ یہ لوگ ہمارے محسن ہیں، چنانچہ ہمیں ان کی ایوارڈ سے بڑھ کر تکریم کرنا ہوگی۔

ہر حل کے ساتھ کوپن چسپاں کرنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 10 / اپریل 2015ء ہے۔

کھوج لگائیے

نام: ____________

شہر: ____________

مکمل پتا: ____________

____

موبائل نمبر: ____________

ہر حل کے ساتھ کوپن چسپاں کرنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 10 / اپریل 2015ء ہے۔

دماغ لڑاؤ

نام: ____________

مقام: ____________

مکمل پتا: ____________

موبائل نمبر: ____________

اپریل کا موضوع ''میلہ چراغاں'' ارسال کرنے کی آخری تاریخ 08 / اپریل 2015ء ہے۔

ہونہار مصور

نام ____________ عمر ____________

مکمل پتا: ____________

____

موبائل نمبر: ____________

میری زندگی کے مقاصد

کوپن پُر کرنا اور پاسپورٹ سائز رنگین تصویر بھیجنا ضروری ہے۔

نام ____________ شہر ____________

مقاصد ____________

____

____

موبائل نمبر: ____________

ح	د	ا	ت	ع	ر	ی	ف	ے	م
ظ	ح	ع	ق	پ	ق	ث	خ	و	ع
غ	پ	ا	ل	ز	ا	م	ا	ب	م
ن	ڑ	ر	ط	س	ن	ز	ت	ڑ	و
ص	ء	ی	چ	و	ض	ظ	ش	غ	ل
ی	س	ق	ب	س	ٹ	ا	ف	چ	ث
ب	و	ف	ی	ح	ے	چ	ق	م	ت
ک	ظ	ٹ	ذ	م	ب	ا	ت	ن	ب
د	ب	ی	ج	ع	ہ	ن	ڈ	م	ح
ج	ر	ت	ا	ل	ء	ک	ٹ	ف	ص

آپ نے حروف ملا کر دس الفاظ تلاش کرنے ہیں۔ آپ ان ناموں کو دائیں سے بائیں، بائیں سے دائیں، اُوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر تلاش کر سکتے ہیں۔ آپ کے پاس وقت دس منٹ کا ہے۔ جن الفاظ کو آپ نے تلاش کرنا ہے وہ یہ ہیں:

الزام، معمول، عجیب، فقیر، شفقت، اچانک، محسوس، نصیب، تعریف، صحبت

براؤنیز

اجزاء:

میدہ:	3/4 کپ	بیکنگ پاؤڈر:	1/2 چائے کا چمچ	کوکو پاؤڈر:	1/3 چائے کا چمچ	مکھن:	چار اونس پگھلا ہوا
انڈے:	دو عدد	ونیلا ایسنس:	ایک چائے کا چمچ	براؤن شوگر:	3/4 کپ	چاکلیٹ کے چھوٹے ٹکڑے:	1/2 کپ

ترکیب:

1- آٹھ انچ کے چوکور اور کم گہرے پین کو چکنائی لگا کر کاغذ لگائیں اور اسے بھی چکنا کر لیں۔

2- ایک پیالے میں انڈے، مکھن، شکر اور ایسنس پھینٹ لیں۔

3- میدہ، بیکنگ پاؤڈر اور کوکو پاؤڈر ایک ساتھ چھان کر انڈوں والے مرکب میں ملا دیں۔

4- چاکلیٹ کے ٹکڑے (یہ چھوٹے چھوٹے چاکلیٹ کے ٹکڑے پیکٹوں میں بند ملتے ہیں جو پکنے پر بھی نہیں گھلتے بلکہ اپنی شکل برقرار رکھتے ہیں اور منہ میں آتے ہوئے بہت اچھے لگتے ہیں) بھی شامل کر کے سانچے میں ڈالیں اور 170 ڈگری سینٹی گریڈ پر تقریباً 25 منٹ بیک کر کے سانچے میں ہی قدرے ٹھنڈا ہونے دیں اور پھر دونوں طرف سے چار چار حصوں میں کاٹ کر سولہ عدد چوکور ٹکڑے کاٹ لیں۔

آئسنگ:

1/2 کپ آئسنگ شوگر میں ایک کھانے کا چمچ پانی ملا کر براؤنیز ڈیزائن بنا لیں۔ ہوا بند ڈبے میں ڈال کر فریج میں رکھ دیں۔ چار چھ روز تک ٹھیک رہیں گے۔

فروٹ کرمبل

فروٹ کرمبل ہو یا ویجی ٹیبل کرمبل، دونوں ہی اپنے منفرد ذائقے اور خستہ پرت کی وجہ سے بہت اچھے لگتے ہیں۔ فروٹ کرمبل میں تازہ پھلوں کی جگہ ڈرائی فروٹ بھی استعمال کیے جا سکتے ہیں، مثلاً خشک خوبانیاں، کھجوریں وغیرہ۔ گرم کرمبل کے ساتھ آئس کریم یا کسٹرڈ پیش کیا جا سکتا ہے۔

اشیاء:

سیب:	دو، تین بڑے بڑے	ڈرائی فروٹ ملا جلا:	1/2 کپ	جئی (Oat):	1/4 کپ
پانی:	ایک کھانے کا چمچ	میدہ:	دو کھانے کے چمچ	لیمن جوس:	ایک کھانے کا چمچ
مکھن:	ایک اونس	کوکونٹ:	ایک کھانے کا چمچ	براؤن شوگر:	1/4 کپ

ترکیب:

1- سیبوں کو اچھی چھیل کر سلائس کاٹ لیں۔ پانی اور لیمن جوس ملا کر پکائیں۔ جب سیب قدرے نرم ہو جائیں تو شیشے کی ڈش میں ڈال دیں۔

2- ایک پیالے میں جئی (Oats)، کوکونٹ، میدہ، مکھن اور شکر ملائیں۔ بھربھرا سا مرکب سیبوں پر چھڑک دیں۔

3- گرم اوون میں تقریباً 25 منٹ تک بیک کریں، حتیٰ کہ "ٹوپنگ" گولڈن براؤن ہو جائے۔

میرے پانچویں سفر کی داستان کچھ یوں ہے کہ چوتھے سفر سے بہت زیادہ مال و دولت حاصل ہوا تھا۔ چناں چہ اس مرتبہ میں نے بجائے دوسرے جہازوں میں سفر کرنے کے اپنا ہی ایک چھوٹا سا بحری جہاز خرید لیا اور اسے تمام ضروری ساز و سامان سے آراستہ بھی کر لیا۔

اب مجھے سمندر میں سازگار ہوا چلنے کا انتظار تھا تاکہ سفر شروع کیا جائے۔ اس دوران میں نے یہ بھی کیا کہ بصرہ کی بندرگاہ پہ اعلان کروا دیا کہ جو تاجر ہمارے ساتھ تجارتی سفر کرنا چاہے، اجازت ہے۔ یوں دس بارہ تاجروں کی جماعت اکٹھی ہوگئی اور میں ان کا بحری سربراہ بن گیا۔

اگلی جمعرات کو بادبان کھولے گئے اور ہمارا سفر شروع ہو گیا۔ سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا۔ ہوا موافق تھی، سمندر پُرسکون تھا اور ساتھی خوش دل تھے اس سے زیادہ اور کچھ چاہیے بھی نہیں تھا۔

ایک دن ہم ایک ویران جزیرے پر اُترے۔ ساحل سے ذرا آگے ایک سفید گنبد بنا ہوا تھا۔ میں نے فوراً پہچان لیا کہ یہ رخ پرندے کا انڈا ہے۔ میں اپنے دوسرے سفر میں یہ بتا چکا ہوں کہ رخ پہاڑوں جتنا بڑا ایک چیل نما پرندہ ہوتا ہے جو ویران جزیروں میں رہتا ہے۔ جب ہم انڈے کے قریب پہنچے تو دیکھا کہ رخ بچہ مکمل ہو چکا ہے اور انڈے کے خول سے باہر آنے کے لیے اس میں چونچ سے سوراخ کر رہا ہے۔

یہ بڑا دل چسپ منظر تھا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ ہم اسے دُور کھڑے ہو کر دیکھتے لیکن میرے ساتھی ایسے بے وقوف نکلے کہ کلہاڑیاں لے کر انڈے پر چڑھ دوڑے اور نوزائیدہ رخ بچے کے ٹکڑے کر دیئے۔ اس کے بعد آگ جلائی گئی اور بھنے ہوئے گوشت کی مزے دار دعوت ہوئی۔ میں اس دوران انہیں مسلسل اس بُرے فعل سے منع کرتا رہا لیکن انہوں نے میری ایک نہ سنی۔

تھوڑی دیر بعد میں نے دُور آسمان پر بادل کے دو ٹکڑے دیکھے جو تیزی سے جزیرے کی طرف آ رہے تھے۔ میں نے چیخ کر ساتھیوں سے کہا کہ یہ رخ بچے کے ماں باپ ہیں، جس قدر جلدی ہو سکے جہاز پر سوار ہو جاؤ تاکہ ہم آئندہ کے خطرے سے بچ سکیں۔

میری نصیحت کا اچھا اثر ہوا۔ ساتھی فوراً سوار ہو گئے اور جہاز تیزی سے ساحل سے دُور ہونا شروع ہو گیا۔ اس دوران وہ دونوں بادل جزیرے کے اوپر پہنچ چکے تھے۔ میرا اندازہ درست تھا۔ یہ نر اور مادہ رخ تھے جو فضا میں پھڑپھڑاتے ہوئے بُری طرح چیخ رہے تھے۔

ان کی چیخوں میں اس وقت زیادہ شدت آ گئی جب انہوں نے دیکھا کہ انڈا ٹوٹا پڑا ہے اور نوزائیدہ کو ہلاک کر دیا گیا ہے۔ تھوڑی دیر فضا میں چکر لگانے کے بعد رخ اسی طرف واپس چلے گئے جدھر سے آئے تھے۔ اس دوران ہمارا جہاز بھی جزیرے سے

بہت دُور کھلے سمندر میں پہنچ چکا تھا۔
خطرہ ٹل چکا تھا لیکن میرا دل دھک دھک کر رہا تھا کہ ظلم آخر ظلم ہے، ہمیں رخ بچے کے ساتھ یہ سب نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اب نہ جانے کیا ہوگا؟ میں نے ملاحوں کو حکم دیا کہ جتنی جلدی ہو سکے جہاز کو یہاں سے بہت دُور لے جاؤ تاکہ ہم آنے والی مصیبت سے بچ جائیں۔

رخ جلد ہی واپس آ گئے، جب وہ جہاز کے قریب پہنچے تو ہم نے دیکھا کہ ان میں سے ہر ایک نے ایک بڑی چٹان اپنے پنجوں میں دبائی ہوئی ہے اور وہ اسے جہاز پر گرانا چاہتے ہیں۔ یہ سب دیکھ کر میرے دل نے کہا کہ اب خیر نہیں، چناں چہ میں نے اسی وقت ایک چھوٹی سی کشتی لے کر سمندر میں چھلانگ لگا دی اور جہاز سے دُور ہو گیا۔

پہلے مادہ رُخ نے اپنی چٹان پھینکی جو جہاز سے کئی گنا بڑی تھی۔ جہاز درمیان سے دو ٹکڑے ہو گیا۔ اس کے بعد نر رُخ اپنے آپ کو جہاز کے اوپر لایا اور پنجے کھول دیئے۔ ہزاروں من وزنی ایک بہت بڑی چٹان جہاز پر آئی اور جہاز کے پرخچے اُڑ گئے۔ میں دُور سے یہ سب دیکھ رہا تھا، بڑا دہشت ناک منظر تھا۔ جہاز ہزاروں ٹکڑوں میں بٹ چکا تھا۔ سامان تجارت تو ایک طرف خود تاجروں کے بارے میں بھی کچھ پتا نہ تھا کہ ان کا کیا بنا؟

بعض مصیبتیں ایسی ہوتی ہیں جو انسان اپنے ہی ہاتھوں مول لیتا ہے۔ بھلا کیا ضرورت تھی میرے ساتھیوں کو ایسی بے کار حرکت کی؟ آج انہی کی وجہ سے مجھ پہ یہ مصیبت آئی تھی۔ میں نے دل ہی دل میں توبہ کی اور اپنے آپ کو موجوں کے سپرد کر دیا کہ دیکھیں یہ مجھے کہاں لے کے جاتی ہیں۔

میری کشتی سارا دن اور ساری رات تیرتی رہی اور اگلی دوپہر کو ایک جزیرے سے جا لگی۔ میں ساحل پر اُترا۔ یہ ساحل عمودی تھا، یعنی اس پر چٹانیں بنی ہوئی تھیں۔ میں چٹانوں پر چڑھ گیا۔ جب ذرا آگے بڑھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ میرے سامنے ایک سرسبز و شاداب باغ پھیلا ہوا ہے۔ یہ دراصل باغ نہ تھا بل کہ سارا جزیرہ ہی باغ کی طرح سرسبز اور ہرا بھرا تھا۔

میں آگے چلتا گیا۔ ہر طرف درخت لہلہا رہے تھے۔ پھول کھلے ہوئے تھے، خوش بو پھیلی ہوئی تھی۔ پرندے گیت گا رہے تھے، ہوا چل رہی تھی اور اس ہوا میں درختوں کی پھل دار شاخیں جھوم رہی تھیں۔ ایک عجیب بات میں نے یہ دیکھی کہ اکثر درخت پھل دار تھے اور شاخیں پھلوں کے بوجھ سے جھکی جھکی جاتی تھیں۔ بھوک تو تھی ہی اور یہ منظر دیکھ کر اور بھوک چمک گئی۔ میں نے پھل توڑ کر چکھے۔ ان کا ذائقہ شیریں تھا۔ میں نے جی بھر کے کھائے اور اللہ کا شکر ادا کیا۔

جزیرے کے بیچوں بیچ ایک ندی رواں دواں تھی۔ یہ ندی کہیں چوڑی ہو جاتی اور کہیں پتلی۔ اسی طرح کہیں اس کی گہرائی زیادہ ہو جاتی اور کہیں کم۔ بہرحال میرے لیے یہ حیران کن بات تھی کہ ایک جزیرے کے درمیان میں اس طرح ایک ندی موجود ہے اور اس کے گرد گھنے پودے ہیں۔

اب بھوک تو مٹ چکی تھی، میں جزیرے کا مزید جائزہ لینے کے لیے اِدھر اُدھر گھومنے پھرنے لگا۔ چلتے چلتے ایک جگہ ایک درخت کے نیچے مجھے ایک بوڑھا آدمی بیٹھا ہوا نظر آیا۔ میں اس کے قریب چلا گیا اور سلام کیا۔ بوڑھے نے بڑی عجیب مسکراہٹ کے ساتھ مجھے دیکھا اور اشارے سے کہا کہ میں اسے اپنے کندھوں پہ سوار کر کے ندی پار کرا دوں۔

یہ بوڑھا بہت ہی کمزور اور خراب حال تھا۔ اس کی داڑھی لمبی تھی لیکن گال پچکے ہوئے تھے۔ بازو بھی پتلے پتلے تھے اور کمر میں خم بھی تھا۔ وہ سالوں کا بیمار نظر آتا تھا۔ ایک حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اس کی دونوں ٹانگیں بالکل پتلی پتلی تھیں۔ مجھے یہ خیال ہوا کہ یقیناً کسی بیماری کی وجہ سے بوڑھے کی دونوں ٹانگیں سوکھ چکی ہیں اور اب یہ چلنے پھرنے سے معذور ہو چکا ہے۔ میرے دل میں رحم بھر آیا اور میں نے جھک کر بوڑھے کو اپنے کندھوں پہ سوار کر لیا۔ اس جگہ ندی کا پاٹ چوڑا تھا اور گہرائی بھی کم نہ تھی۔ میں نے بڑی مشکل اور مشقت سے اسے ندی پار کروائی اور دوسرے کنارے پہ جا کر جھک گیا تاکہ وہ نیچے اُتر آئے لیکن بوڑھا میرے کندھوں سے نہ اُترا۔ میں نے ذرا آگے کو ہو کر اپنے آپ کو جھٹکا دیا کہ وہ نیچے آ جائے لیکن اس نے اپنی دونوں ٹانگیں میری گردن کے گرد لپیٹ کر میرا گلا اس زور سے دبایا کہ دم گھٹنے لگا۔

مجھے سمجھ نہ آیا کہ میں کیا کروں؟ میں نے تو اس بوڑھے کے ساتھ احسان کیا تھا اور اسے ندی پار کروائی تھی لیکن یہ اب میرے کندھوں سے اُترنے کا نام ہی نہ لے رہا تھا۔ اسی دوران بوڑھے نے پھر وہی کچھ کیا جو اس سے پہلے کر چکا تھا، یعنی اپنی پتلی پتلی ٹانگوں سے میری گردن اس زور سے دبائی کہ میری آنکھیں باہر کو اُبل

آئیں۔ اس کے فوراً بعد اس نے ذرا سی گرفت ڈھیلی کر کے، بائیں پاؤں سے میری پسلیوں پہ ایسی ٹھوکر لگائی کہ مجھے خدا یاد آ گیا۔ پھر اس نے میرے بال پکڑ کے ایسے نوچے کہ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

میں زمین پر گرنے کو ہی تھا کہ بوڑھے نے سامنے کے درختوں کی طرف اشارہ کر کے حکم دیا کہ میں وہاں جاؤں اور پھل اکٹھے کر کے اسے دوں۔ میں اس کے حکم کی تعمیل میں وہاں پہنچا، پھل اکٹھے کیے اور ہاتھ اونچا کر کے اسے کھانے کو دیئے۔ بوڑھے نے پھل کھا کے منہ سے عجیب فاتحانہ انداز کی آوازیں نکالیں۔ یہ گویا اس بات کا اشارہ تھا کہ آج کے بعد تم میرے غلام ہو اور پھر اس دن کے بعد ہوا بھی یوں ہی، میں جہاں جاتا بوڑھا میرے کندھوں پہ سوار رہتا، حتیٰ کہ وہ سونے کے وقت بھی مجھ سے جدا نہ ہوتا اور صبح کو اکثر میری پسلیوں پہ ایڑیاں مار مار کے مجھے بیدار کرتا۔ میری ذمہ داری تھی کہ میں جو کچھ بھی کھاؤں اسے بھی کھلاؤں ورنہ وہ گلا دبا دبا کر اور بال نوچ نوچ کر میرا بُرا حال کر دیتا۔

اب میری سمجھ میں یہ آ چکا تھا کہ جس بوڑھے کو میں بیمار یا کمزور سمجھ رہا تھا وہ نہ بیمار ہے نہ کمزور بلکہ کوئی بہت ہی چال باز انسان ہے جو اس طرح مکر و فریب کے ذریعے میرے کندھوں پہ سوار ہو گیا ہے، چناں چہ میری زندگی بہت ہی پریشانی اور مصیبت میں کٹنے لگی اور میرے ساتھ ہوتا بھی یوں ہی ہے کہ ایک مصیبت سے بچتا ہوں تو دوسری میں آ پھنستا ہوں۔

جزیرے پر پھلوں کی البتہ بہت کثرت تھی اور ہر قسم کے میوے کھانے کو مل جاتے تھے۔ یہاں میں نے ایسے ایسے پھل بھی دیکھے جو بصرہ یا بغداد میں نہ دیکھے تھے۔ ندی کا پانی بھی بہت ٹھنڈا تھا اور کوئی پریشانی بھی نہ تھی بس تکلیف تھی تو اس بوڑھے کی تھی جو ہر وقت گردن سے چمٹا بیٹھا تھا۔ اسی کی وجہ سے میری زندگی بے رنگ ہو کر رہ گئی تھی اور میں اداسی کے ساتھ دن رات گزار رہا تھا۔

ایک دن اتفاق سے میں نے ایک درخت کے نیچے بہت سے کدو پڑے دیکھے۔ درخت پر کدو کی بیل چڑھی ہوئی تھی اور یہ کدو وہیں سے گرے تھے۔ میں نے کیا کیا کہ ایک بڑا سا کدو اُٹھایا اور اس کے اندر کا گودا صاف کر کے اسے پیالے جیسا بنا لیا۔ ذرا آگے انگور کی بیلیں چڑھی ہوئی تھیں۔ میں نے اس کدو کے پیالے میں کئی خوشے نچوڑے اور اسے انگور کے رس سے مکمل طور پر بھر لیا، اس کے بعد میں نے اسے ایک عمدہ جگہ رکھ دیا۔ وہ بوڑھا اس دوران میری اس ساری کارروائی کو دیکھتا رہا۔

کئی دن کے بعد جب میں اس طرف دوبارہ آیا تو میری اُمید کے مطابق کدو کے پیالے میں نشہ آور مشروب تیار ہو چکا تھا۔ میں نے ایک گھونٹ بھرا، کیف و سرور سے مجھے مزہ سا آ گیا۔ میں نے کدو ایک طرف رکھا اور جھومنے لگا۔

میری اُمید کے عین مطابق بوڑھے نے فوراً دائیں پاؤں کی ایڑی میری پسلی میں ماری کہ میں اسے بھی پلاؤں۔ میں نے کدو اُٹھا کر اوپر کیا۔ اس نے بے صبری سے اچک لیا اور آخری قطرے تک سارا پی گیا۔

کدو میں انگور کا رس سڑ سڑ کے نشے کی صورت اختیار کر چکا تھا۔ بوڑھا پیتے ہی چکرایا اور اس کی ٹانگوں کی گرفت میری گردن سے ڈھیلی ہونا شروع ہو گئی۔ تھوڑی دیر میں ہی میں نے محسوس کیا کہ اب میں بوڑھے کو اپنی گردن سے اُتار سکتا ہوں۔

چناں چہ میں قریبی پتھروں کے پاس گیا، ہاتھ اُونچے کر کے بوڑھے کو سر سے اُتارا اور زور سے زمین پر پٹخ دیا۔ بوڑھا اس انداز سے پتھریلی زمین پر گرا کہ دوبارہ کبھی نہ اُٹھ سکا۔

اپنے کندھوں کا یہ بوجھ دُور کر کے میں نے سجدۂ شکر ادا کیا اور انتظار کرنے لگا کہ کب کوئی جہاز یہاں سے گزرے تو میں اپنے گھر پہنچوں۔ میں پہلے یہ بتا چکا ہوں کہ پورے جزیرے پر سوائے اس خطرناک بوڑھے کے کوئی بھی نہ تھا، ہریالی اور سرسبزی البتہ بہت تھی۔

ایک ہفتے بعد ہی ایک جہاز قریب سے گزرا میں نے ساحل کی چٹانوں پہ کھڑے ہو کر پگڑی لہرائی وہ سیدھے میری ہی جانب آ گئے۔ اس طرح بڑی ہی محنتوں اور مشقتوں کے بعد میں واپس بغداد پہنچا۔ پہلے کبھی اگر میں بغداد آ رہا ہوتا تھا تو میرے ساتھ مال و دولت اور ہیرے جواہرات سے بھرے اونٹ ہوئے تھے لیکن اس مرتبہ میں اس طرح خالی ہاتھ تھا کہ سوائے ایک تھیلے کے میرے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔ ضروری تو نہیں کہ انسان جو کچھ سوچ لے وہی ہو۔ کام یابی اور ناکامی زندگی کا حصہ ہے۔ میری جان ہی بچ گئی تھی کیا یہ کم تھا؟ جہاز والوں نے مجھے بتایا کہ وہ بہت خطرناک بحری بوڑھا تھا جو لوگوں کو اسی طرح ٹانگوں سے گھوٹ گھوٹ کے مارتا تھا۔ یہ سارا جزیرہ اسی کی وجہ سے مشہور تھا، اسی لیے عام جہاز اس طرف کم آتے ہیں۔ میں وہ پہلا شخص ہوں جو اس کے چنگل سے بچ گیا تھا۔

آئس ھاکی کی تاریخ

عبدالوحید مزاج

ہاکی کا کھیل دُنیا کے بہت سے ممالک میں کھیلا جاتا ہے مگر وہ ممالک جہاں برف باری زیادہ ہوتی ہے، وہاں ہاکی کی ایک اور قسم مقبول ہے جو برف پر کھیلی جاتی ہے۔ جی ہاں! ہاکی کی اس قسم کو برفانی ہاکی یا آئس ہاکی کہا جاتا ہے۔

آئس ہاکی کینیڈا کا قومی کھیل ہے، برف پر ہاکی کھیلنے کی روایت بھی اسی سرد ملک سے شروع ہوئی۔ آئس ہاکی کا پہلا مقابلہ دسمبر 1879ء میں کینیڈا کے شہر مانٹریال میں یہ میچ میکگل یونیورسٹی کے طلباء پر مشتمل دو ٹیموں کے درمیان کھیلا گیا جس میں ہر ٹیم پندرہ کھلاڑیوں پر مشتمل تھی۔ کھلاڑیوں نے ہاکی اسٹک کی جگہ ڈنڈیاں استعمال کیں۔ ایک دوسری روایت ہے کہ آئس ہاکی کا آغاز نووا اسکوٹیا میں ہوا۔ ابتدائی دور میں 9 کھلاڑیوں پر مشتمل ٹیم تھی اور 1886ء میں یہ تعداد کم کر کے سات کر دی گئی اور کم ہوتی ہوئی یہ تعداد چھ کھلاڑیوں پر رہ گئی۔

1894-95ء کے موسم سرما میں امریکہ کے کالج کے طلباء نے کینیڈا کا دورہ کیا اور وہاں یہ کھیل دیکھ کر بہت متاثر ہوئے اور وطن واپسی کے بعد آئس ہاکی کو امریکہ میں متعارف کروایا۔

اسی ہی سیزن میں آئس ہاکی کے سب سے بڑے اور مشہور ٹورنامنٹ اسٹینلے کپ کا آغاز ہوا جس کی پہلی فاتح ٹیم مانٹریال ٹرپل رہی تھی۔ اپنی مقبولیت کے باعث 1907ء میں یہ کپ دو مرتبہ کھیلا گیا۔ 1910ء تک پروفیشنل اور امیچر کھلاڑیوں کو مل جل کر کھیلنے کی اجازت تھی لیکن مشرقی کینیڈا میں دی نیشنل ہاکی ایسوسی ایشن کی تشکیل کے ساتھ ہی یہ سلسلہ ختم ہو گیا اور مغربی امریکہ اور دیگر شہروں میں دی پیسفک کوسٹ لیگ کے نام سے مقابلوں کی ابتداء ہوئی اور عالمی چیمپئن شپ کے مقابلے سب سے پہلے 1920ء میں شروع ہوئے جنہیں بعد میں اولمپک کھیلوں میں شامل کر لیا گیا۔ عالمی چیمپئن شپ کے ان مقابلوں میں صرف شوقیہ کھلاڑیوں کو شرکت کی اجازت تھی مگر 1977ء سے پیشہ ور کھلاڑی بھی شرکت کے اہل قرار پائے۔ اب تک آئس ہاکی کا طویل ترین میچ 1936ء میں ڈیٹرائٹ اور مانٹریال کے مابین کھیلا گیا جو 2 گھنٹے 56 منٹ اور 30 سیکنڈ تک جاری رہا جسے ڈیٹرائٹ کی ٹیم نے صفر کے مقابلہ میں ایک گول سے کام یابی حاصل کی تھی۔

آئس ہاکی جس مخصوص میدان میں کھیلی جاتی ہے اسے رنک کہتے ہیں یہ دو سو فٹ لمبا اور پچاسی فٹ چوڑا ہوتا ہے۔ برف کا یہ میدان لکڑی کی باڑھ سے جو سطح برف سے 40 تا 48 انچ بلند ہوتی ہے، گھرا ہوتا ہے۔ آئس ہاکی کے گول کا رقبہ بھی سن لیں کہ یہ چھ فٹ چوڑا اور چار فٹ لمبا ہوتا ہے اور اس میں استعمال ہونے والی گیند نہیں بلکہ ربڑ کی بنی ہوئی ایک گول ٹکیا استعمال ہوتی ہے۔ ربڑ کی اس ٹکیا کو "پک" کہتے ہیں۔ یہ ایک انچ موٹی اور قطر میں 3 انچ ہوتی ہے جس کا معیاری وزن ساڑھے پانچ تا چھ اونس ہوتا ہے۔ آئس ہاکی کی اسٹک 55 انچ لمبی ہوتی ہے۔ اس کا بلیڈ تین انچ چوڑا ہوتا ہے، تاہم گول کیپر کی اسٹک کا بلیڈ ساڑھے تین تا ساڑھے چار انچ چوڑا ہو سکتا ہے اور میچ میں بیس بیس منٹ کے تین وقفے ہوتے ہیں جس میں تمام کھلاڑی اپنے پیروں پر برف پر پھسلنے والے جوتے (اسکیٹس) پہنے ہوئے ہوتے ہیں اور وہ نہایت تیزی کے ساتھ پھسلتے ہوئے برف کے میدان میں اِدھر اُدھر دوڑتے رہتے ہیں۔ آئس ہاکی روس، امریکہ، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور یورپ کے چند ممالک میں بہت مقبول ہے۔ ان ممالک میں خصوصی اسٹیڈیم ہیں جہاں میدان میں آئس ہاکی کے لیے بطورِ خاص برف جمائی جاتی ہے۔ ہاں! کھیل میں سب سے زیادہ اعزازات روس کے پاس ہیں۔ وہ سات مرتبہ چیمپئن رہا ہے۔ عام ہاکی کے برعکس اس ہاکی میں گول بہت زیادہ ہوتے ہیں، اس لیے تو 1987ء میں آسٹریلیا نے نیوزی لینڈ کو صفر کے مقابلہ میں 58 گول سے شکست دی۔ آئس ہاکی کے مشہور کھلاڑیوں میں رچرڈ طوریانی، گورڈی ہو اور رابرٹ مارون شامل ہیں۔ ☆☆☆

میرا خون بھی شامل ہے تزئین گلستان میں
مجھے بھی یاد کر لینا چمن میں جب بہار آئے

☆

شہیدوں کے لہو سے جو زمین سیراب ہوتی ہے
بڑی زرخیز ہوتی ہے بڑی شاداب ہوتی ہے
(عظیم ڈوگر، ملتان)

آہستہ قدم نیچی نگاہ پست صدا ہو؟ خوابیدہ یہاں رسولِ عربیؐ ہے
اے زائر بیت نبویؐ یاد رہے یہ ہیں بے قاعدگیاں جنبشِ لب بے ادبی ہے
(محمد اکرم شریف صدیقی، میانوالی)

تمنا دردِ دل کی ہو تو کر خدمت فقیروں کی
نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں

☆

اس دور کی ظلمت میں ہر قلب پریشاں کو
وہ داغ محبت دے جو چاند کو شرما دے۔
(محمد احمد خان غوری، بہاول پور)

حالی کا یہ نکتہ ہے ہمیں یاد برابر
ہیں علم و عمل دونوں کے اعداد برابر
(محمد قمر الزمان صائم، خوشاب)

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو، زباں تو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل! کہ مغلوب گماں تو ہے
(محمد ریان احمد، اسلام آباد)

ان حسرتوں کو کہہ دو کہیں اور جا بسیں
اتنی جگہ کہاں ہے دل داغ دار میں
(رانا بلال احمد، بھکر)

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا، کوئی غم گسار ہوتا
(عاتکہ رحیم، جوہر آباد)

آسمان تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزہ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے
(کشف طاہر، لاہور)

تو آتش نمرود سے واقف نہیں سعدی
اس آگ میں کھلتے ہیں گلاب اور طرح کے
(نمرہ عبدالخالق، لاہور کینٹ)

کس کو پہچانوں کہ ہر پہچان مشکل ہو گئی
خود نما سب لوگ ہیں اور رونما کوئی نہیں
(اسامہ ظفر راجہ، جہلم)

عزت ہے بڑی چیز جہان تگ و دو میں
پہناتی ہے درویش کو تاج سر دارا
(ثمرہ احمد، ڈسکہ سیال کوٹ)

میرے بچپن کے دن بھی کیا خوب تھے اقبال
بے نمازی بھی تھا بے گناہ بھی تھا
(عائشہ خالق، لاہور)

کرو مہربانی تم اہلِ زمیں پر
خدا مہرباں ہو گا عرش بریں پر
(فاطمہ زاہد، ٹیکسلا)

خدا کرے میری ارض پاک پہ اُترے
وہ فصلِ گل جسے اندیشہ زوال نہ ہو
(زائش خورشید، ایبٹ آباد)

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقین پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
(ماریہ عبدالناصر، کلور کوٹ)

توکل کا یہ مطلب ہے کہ خنجر تیز رکھ اپنا
نتیجہ اس کی تیزی کا مقدر کے حوالے کر
(اقصیٰ عدالت، گجرات)

کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسا
مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی
(محمد احمر چوہدری، راول پنڈی)

☆☆☆

بوجھو تو جانیں

1- کھائے لوہا اُگلے آگ
ہر دم موت کے گائے راگ

2- اس نے سنوارے کام سارے
ورنہ ہوتے احمق سارے

3- رات کا ساتھی رات نبھائے
دن نکلے غائب ہو جائے

محمد بلال عارف سیفی، پل بجواں

4- ٹانگیں ہیں چار مگر بے کار
چلنا بھی ہے دُشوار

5- جو بھی دیکھی جائے، وہی پکڑی جائے
جو بھی ہاتھ میں آئے، وہی ماری جائے

6- ایک طویلا بارہ گھوڑے ایک ایک کر کے وہ سب دوڑے
کوئی بڑا تھا کوئی تھا چھوٹا جو بھاگا وہ کبھی نہ لوٹا

عبدالجبار سیال، ڈیرہ غازی خان

7- وہ کیا حرف ہے جو کراچی، لاہور اور اسلام آباد میں ہے مگر
کوئٹہ، سکھر اور جھنگ میں نہیں؟

8- دو ممالک کے نام بتاؤ جن کے پہلے دو حروف ہٹانے سے
پان اور نان بنتا ہے۔

9- بڑھے تو بُرا لگے کاٹ پھینکیں تو چاند جیسا لگے

وشمہ خان، لاہور

10- سر ٹوٹے سل بٹا ٹوٹے
وہ چیز کبھی نہ ٹوٹے

11- ننھی سی بٹیا گلیلے کا پیٹ
آئے گا راجا پھاڑے گا پیٹ

انعم سعید، فیصل آباد

جوابات: 1-توپ 2-عقل 3-چاند 4-چارپائی 5-جوں 6-سال اور مہینے
7-الف 8-جاپان اور لبنان 9-ناخن 10-پرچھائیں 11-چھالیا، سروتہ

کس کا کھونٹا

اوپر کی تصویر میں پانچ چیزیں پانچ کھونٹوں سے بندھی ہیں۔ ہر کھونٹے پر نمبر دیا گیا ہے۔
اب یہ بتاؤ، کہ کون سی چیز کس کھونٹے سے بندھی ہے۔ ذرا محنت کی ضرورت ہے۔

کتنی پیاری سی بی مانو

دیکھا بی مانو کتنے سکون سے آنکھیں بند کر کے مسکرا رہی ہے۔
آپ کو پتہ ہے وہ کس بات پر مسکرا رہی ہے؟

ٹرین کے اچانک رُکنے سے ہماری جانوں کا سلسلہ بھی رُک گیا۔ ایک تو کڑاکے کی سردی دوسرا رات کے آخری پہر ٹرین کا ایک ویران جنگل میں یوں رُکنا ہمارے لیے باعثِ حیرت تھا۔ دوسرے مسافروں کی طرح ہم بھی ٹرین کی بوگی سے باہر آئے۔ ٹرین کے ڈرائیور سے ٹرین روکنے کی وجہ معلوم کی، ڈرائیور نے بتایا کہ ٹرین کا انجن خراب ہوگیا ہے، لہٰذا اس کو ٹھیک ہونے میں کافی وقت لگے گا، شاید صبح بھی ہو جائے۔ ہم نے اپنی اپنی گھڑی میں دیکھا تو رات کے سوا دو بج رہے تھے۔ ہم تینوں دوستوں نے ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا اور بغیر بولے ایک دوسرے کے خیالات سمجھ گئے یعنی ایک ویران جنگل میں ہم لوگ اتنا طویل انتظار کیسے کر سکتے تھے۔ اگر ٹرین کسی ریلوے اسٹیشن پر خراب ہوتی تو ہمیں بھی وقت گزارنے کے لیے کچھ نہ کچھ میسر آ جاتا لیکن بدقسمتی سے ٹرین کو بھی یہیں خراب ہونا تھا، خیر باقی مسافروں کی طرح ہم تینوں دوست بھی اِدھر اُدھر وقت گزارنے کے لیے چہل قدمی کرنے لگے۔

میں (اکبر)، عابد اور مظہر تینوں گہرے دوست تھے، ہم تینوں ہم عمر اور ہم جماعت بھی تھے اور سونے پہ سہاگہ پڑوسی بھی تھے۔ ہم تینوں کا تعلق مڈل کلاس گھرانوں سے تھا۔ ویسے تو ہمارے والدین نے سب کو بڑی اچھی تعلیم و تربیت دی تھی، ہم سب کا بہت اچھے طریقے سے خیال رکھا تھا اور ہماری ہر جائز خواہش بھی پوری کرتے رہتے تھے لیکن پچھلے دنوں ہم نے اپنے والدین کے سامنے ایک مطالبہ رکھ دیا کہ ہمیں موٹر سائیکل خرید کر دیں۔ بس پھر کیا تھا ہر طرف سے لیکچر ہی لیکچر آنا شروع ہو گئے۔

"بیٹا! تم ابھی چھوٹے ہو، جب بڑے ہو جاؤ گے تو آپ کو موٹر سائیکل بھی دلوا دیں گے۔ ابھی آپ اپنا دھیان پڑھائی پر دیں، یہ عمر موٹر سائیکل چلانے کی نہیں ہے۔"

ابا جان کی بات سن کر میں نے تو دو دن کھانا بھی نہیں کھایا تھا جب کہ عابد اور مظہر بھی اپنے والدین سے ناراض ہو گئے تھے۔ تبھی ہم تینوں نے مل کر والدین سے اپنے مطالبات منوانے کے لیے ایک پلان بنایا تھا۔ پلان یہ تھا کہ ہم تینوں دوست اپنے اپنے والدین کو بغیر بتائے راول پنڈی سے کراچی بذریعہ ٹرین سفر کریں گے۔ کراچی میں میرے ماموں جان کا کپڑے کا کاروبار ہے اور وہ

اپنی فیملی کے ساتھ وہیں پر مقیم ہیں۔ ابھی پچھلی گرمی کی چھٹیوں میں اپنی فیملی کے ہمراہ ہم لوگ کراچی گئے تھے جہاں پر ہم لوگوں نے گرمیوں کی چھٹیاں گزاری تھیں۔ ماموں جان نے خصوصی طور پر مجھے پورے کراچی کی سیر کروائی تھا اور ہم لوگ سمندر پر بھی گئے تھے اور وہاں پر خوب مستی کی تھی۔

ہمارا پلان تھا کہ ہم لوگ کراچی جا کر ماموں کو سرپرائز دیتے اور وہاں سے اپنے والدین کو اطلاع دیتے کہ اگر ہمارے مطالبات نہیں مانیں جائیں گے تو ہم واپس نہیں آئیں گے۔ اس لیے ہم نے چپکے سے کراچی کا ٹکٹ لیا اور اسکول سے واپسی پر گھر کے بجائے ہم لوگ راول پنڈی ریلوے اسٹیشن پر اکٹھے ہو گئے اور زندگی میں پہلی مرتبہ ٹرین کا سفر کرنے لگے۔

''یار اکبر، ہم لوگ کس علاقے میں ہیں؟'' عابد کے سوال پر میں چونکا اور خیالات کی دُنیا سے باہر آ گیا۔

''یار اللہ جانے ٹرین کہاں رکی ہے! یہاں تو ہر طرف جنگل ہی جنگل ہے، نہ بندہ نہ بندے کی ذات! ہر طرف ہُو کا عالم ہے۔''

مظہر بولا: ''یار ہم لوگ یوں ہی کب تک باتیں کرتے رہیں گے؟ ہلکی پھلکی تفریح کے لیے کوئی آئیڈیا ہی سوچو!'' مظہر کی بات سن کر عابد نے میری طرف دیکھا اور بولا: ''دوستو! میرے دماغ میں ایک آئیڈیا آیا ہے، اگر آپ لوگ رضامند ہوں تو سیر کی سیر اور وقت بھی گزر جائے گا۔'' ہمارے پوچھنے پر اس نے بتایا: ''یارو! ہم لوگوں نے آج تک جنگل کو یا تو فلموں میں دیکھا ہے یا پھر کہانیوں میں سنا ہے، آج موقع بھی ہے اور وقت بھی، سو کیوں نہ تھوڑی دیر جنگل کی سیر کی جائے۔ اس سے تفریح کی تفریح اور جنگلی پھل بھی کھانے کا موقع ملے گا۔''

عابد کا آئیڈیا ہمیں بھی پسند آیا اور ساتھ والی سیٹ پر ایک مسافر سے کہا۔ ''انکل! ہمارے سامان کا خیال رکھنا، ہم لوگ ذرا جنگل سے ہو آئیں۔''

''بیٹا! جنگل بہت خطرناک ہے، ایسے میں آپ لوگوں کا وہاں جانا خطرے سے خالی نہیں ہے۔'' بوڑھے انکل کی نصیحت ہم لوگوں نے سنی اَن سنی کر دی اور ہم لوگ باتیں کرتے ہوئے جنگل میں داخل ہو گئے۔ باتوں ہی باتوں میں ہم لوگ کافی دُور نکل آئے تھے جس کا ہمیں پتا ہی نہیں لگا۔ جنگل کافی گھنا ہو گیا تھا اور کبھی کبھار گیدڑ کے چلّانے کی آواز ہمیں خوف کا احساس دلاتی تھی۔

ہمارے موبائل فون وہاں پر کام نہیں کر رہے تھے اور نہ ہمارے پاس کوئی ٹارچ وغیرہ تھی لیکن شکر ہے کہ چاند کی چاندنی اپنے عروج پر تھی جس کی وجہ سے ہمیں جنگل کے کچے راستے بھی صاف دکھائی دے رہے تھے اور اندھیری رات کا ڈر بھی محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ ہم لوگ کبھی جنگلی پھل کھاتے کبھی آپس میں مذاق کرتے، مطلب کہ ہم لوگ خوب انجوائے کر رہے تھے کہ اچانک ایک سایہ ہم لوگوں کے سامنے سے گزرا اور جھاڑیوں میں غائب ہو گیا۔

''دوستو! یہ کیا چیز تھی؟'' ہم لوگ خوف سے سہم گئے اور ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

''کوئی نہیں یار! یہ ہمارا وہم بھی ہو سکتا ہے۔''

دوستوں میں پڑھائی کے معاملے میں مَیں کچھ تیز تھا اس لیے میں نے انہیں حوصلہ دلانے کی تھوڑی سی کوشش کی۔

''یار! اس سائے کو ہم تینوں نے دیکھا تو یہ وہم کیسا؟''

عابد کی بات پر میں کچھ سوچنے لگا اور کہا: ''دوستو! ہمیں واپس جانا چاہیے اور ٹائم بھی بہت ہو گیا ہے۔'' ہم لوگ واپس مڑے۔

''یار ہم لوگ راستہ بھول چکے ہیں، واپس کیسے جائیں گے؟'' مظہر نے ڈرتے ہوئے کہا تو میں نے جواب دیا: ''یار بس چلتے جاؤ، اُمید ہے کہ بہت جلد ہم لوگ ریلوے ٹریک پر پہنچ جائیں گے۔'' میں مسلسل انہیں دلاسا دیئے جا رہا تھا اور اس طرح ہم لوگ جنگل کی انجان پگڈنڈیوں سے ہوتے ہوئے اپنی منزل کی طرف چل رہے تھے کہ اچانک مظہر چلّایا: ''یارو پیچھے تو دیکھو!'' جیسے ہی ہم لوگوں نے پیچھے مُڑ کر دیکھا تو ہماری سٹی گم ہو گئی کیا دیکھتے ہیں کہ ایک سایہ مسلسل ہمارا پیچھا کرتا ہوا ہماری طرف آ رہا تھا اور بڑی تیزی سے ہماری طرف بڑھ رہا تھا جسے دیکھ کر ہماری آنکھیں خوف اور دہشت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ پھر کیا تھا آگے آگے ہم اور پیچھے پیچھے وہ سایہ، ہم لوگ اس طرح دوڑ رہے تھے جس طرح ریس میں گھوڑے دوڑتے ہیں۔ گولی کی سپیڈ سے ہم آگے دوڑے جا رہے تھے اور ایک دوسرے کو کوسے جا رہے تھے لیکن ہمارے کوسنے کا کوئی فائدہ نہیں کیوں کہ وہ سایہ مسلسل ہمارا پیچھا کر رہا تھا۔ آخر کار ہماری دوڑ کام آ گئی اور ہم لوگ ایک ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں درخت کم تھے۔ وہاں ایک برگد کے ٹیلے کے نیچے ہم لوگوں نے سانس لیا اور

وہ پُراسرار سایہ بھی دکھائی نہیں دیا۔ ہم لوگ بُری طرح ہانپ رہے تھے اور ہانپتے ہانپتے سانس بحال ہوگئی اور تھوڑا سکھ کا سانس لیا۔ میں نے اپنا موبائل فون نکالا تاکہ کسی سے رابطہ ہی کر سکوں لیکن اس جنگل میں ہمارے موبائل فون بھی کام نہیں کر رہے تھے۔ ایسے میں عابد چڑ کر بولا: ''دوستو! ہمیں اپنی غلطی کی سزا مل گئی کیوں کہ ہم نے اپنے والدین کی نافرمانی کی ہے اور کاش میں اس پلان میں آپ لوگوں کے ساتھ شامل نہ ہوتا تو کم از کم اس مصیبت میں تو نہ پھنستا۔''

عابد کی بات واقعی ٹھیک تھی لیکن پھر بھی ہم نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا: ''دیکھو عابد! اب ایسی باتوں کا کوئی فائدہ نہیں، اور سچ پوچھو تو مصیبت کی اس گھڑی میں ہمیں بھی اپنے ماں باپ بہت یاد آ رہے ہیں اور اپنی غلطی کا احساس بھی ہے لیکن یہ وقت ہمت ہارنے کا نہیں ہے اور وہ پُراسرار سایہ بھی ابھی کہیں نظر نہیں آ رہا ہے۔ ابھی صبح کی سپیدی بھی نظر آ رہی ہے لہٰذا ہمیں جلد سے جلد ریلوے ٹریک کو ڈھونڈنا چاہیے۔''

ابھی ہم باتوں میں مصروف تھے کہ ہمیں ٹرین کے ہارن کی آواز سنائی دی جو بالکل نزدیک سے آ رہی تھی۔

''دوستو! لگتا ہے ٹرین ٹھیک ہوگئی ہے اور ہم لوگ بھی ٹرین کے نزدیک ہیں اور یہ آواز ہمارے دائیں طرف سے آ رہی ہے، سو جلدی بھاگو تاکہ ہم ٹرین تک پہنچ سکیں۔'' پھر ہم لوگوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ ٹرین کی طرف سرپٹ دوڑنے لگے۔ اس سخت سردی میں بھی ہمارے پسینے چھوٹے ہوئے تھے اور ہماری حالت دیکھنے کے لائق تھی، شاید زندگی میں کبھی اتنا نہیں بھاگے ہوں گے جتنا آج بھاگے تھے۔ ہمارے پاؤں بُری طرح سے جھلس چکے تھے اور کانٹے دار جھاڑیوں کی وجہ سے ہمارے کپڑے بھی جگہ جگہ سے پھٹ چکے تھے لیکن پھر بھی ہم بھاگے جا رہے تھے۔

آخرکار ہماری محنت رنگ لائی اور ہم لوگ ریلوے ٹریک پر پہنچ ہی گئے لیکن یہ کیا......؟ ٹرین تو بڑی تیزی سے آگے جا رہی تھی اور ٹرین کو پکڑنے کے لیے ہم لوگوں نے بھی تیز دوڑ لگا دی لیکن ہماری اسپیڈ سے ٹرین کی اسپیڈ کہیں زیادہ نکلی اور دیکھتے ہی دیکھتے ٹرین چھوٹ گئی۔ ٹرین کے چھوٹتے ہی ہمارے حوصلے بھی چھوٹ گئے اور ہم لوگ بھی تھکے ہارے مایوس ہو کر ریلوے ٹریک پر بیٹھ گئے۔ ہم لوگ کافی دیر تک خاموش بیٹھے رہے اور ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہے۔ ہم لوگوں کی حالت بہت خراب ہو چکی تھی اور اپنے پلان کی ناکامی پر بہت افسردہ تھے۔ اب تو پچھتاوے نے ہمیں آ گھیرا۔ ہمیں کوئی لفظ نہیں مل رہا تھا جس سے ہم اپنی غلطی کا اعتراف

کر سکیں۔

''یار کاش! ہم اپنے والدین کی بات مان لیتے تو یہ دن نہ دیکھتے، ہم نے اپنے ماں باپ کا دل دکھایا ہے جس سے خدا بھی ناراض ہوگیا ہے۔'' مظہر کی بات پر ہم نے بھی اپنی غلطی تسلیم کی اور اپنی غلطی کی تلافی کے لیے ہم لوگوں نے واپسی کا فیصلہ کیا۔

''دوستو کہتے ہیں کہ اگر صبح کا بھولا شام کو آ جائے تو اسے معاف کر دینا چاہیے۔ سو ہمیں بھی اپنے والدین سے معافی مانگنی چاہیے اور اللہ تعالیٰ کے آگے توبہ کرنی چاہیے۔'' میری بات پر سب نے اثبات میں سر ہلایا۔ صبح ہو چکی تھی اور سورج کی پہلی کرن نے جیسے ہماری تھکان اُتار دی ہو اور ہم لوگ شہر کی تلاش میں نکلے۔ چلتے چلتے آخرکار ہمیں ایک چھوٹا سا شہر نظر آیا۔ وہاں ہم نے ایک ہوٹل میں ناشتا وغیرہ کیا اور سیدھا بس اڈے پہنچے۔ وہاں ہمیں راول پنڈی کی ایک بس ملی اور اس طرح ہم لوگ واپس اپنے شہر پہنچ گئے۔ جب ہم لوگ اپنے اپنے گھروں میں پہنچے تو ہمارے والدین کی خوشی قابلِ دید تھی۔ میری والدہ اور ابا زار و قطار رو رہے تھے۔

''میرے لال تم کہاں چلے گئے تھے، ہم نے تجھے کہاں کہاں نہیں ڈھونڈا، تمہیں پتا ہے کہ تمہارے دوستوں کے گھر والے بھی کتنا پریشان تھے۔'' میری امی رو بھی رہی تھی اور شفقت سے مجھے پیار بھی کر رہی تھی، جب کہ میرے ابو بھی آنسو بہا رہے تھے اور کہہ رہے تھے۔ ''بیٹے تم کہاں چلے گئے تھے، ہم نے تو ریڈیو اور ٹی وی پر بھی آپ لوگوں کی گم شدگی کی اطلاع دے دی تھی اور پتا ہے آپ کی ماں نے کل سے کچھ بھی نہیں کھایا۔''

''بس ابو! خدا کے واسطے مجھے معاف کیجئے، میں وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ ایسی غلطی نہیں کروں گا اور فضول قسم کی فرمائشوں سے باز آؤں گا۔ آپ جس طرح کہیں گے، اسی طرح کروں گا۔''

''ٹھیک ہے بیٹا لیکن آپ لوگ کہاں گئے تھے؟''

تب میں نے ابو کو سارا واقعہ سنایا تو انہوں نے ہماری جان بچ جانے پر اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا کیا اور مجھ سے وعدہ بھی کیا کہ جب میری عمر موٹر سائیکل چلانے کی ہو جائے گی تو وہ مجھے ضرور موٹر سائیکل خرید کر دیں گے۔

بچو! آج ہم تینوں دوست ایک اچھے شہری کی حیثیت میں زندگی بسر کر رہے ہیں لیکن آج بھی اپنے بچپن کا یہ قصہ یاد کر کے پچھتاتے ہیں کہ کاش ہم لوگوں نے اپنے والدین کا کہا مانا ہوتا تو اس مصیبت میں نہ پھنستے۔ بچو! آپ کو بھی اپنے والدین کی فرماں برداری کرنی چاہیے اور غیر ضروری فرمائشوں سے پرہیز کرنا چاہیے۔ دیکھو نا! اگر ہمارے والدین ہمیں موٹر سائیکل خرید کر دیتے تو یقیناً ہمیں کسی حادثے کا سامنا کرنا پڑتا کیوں کہ اس وقت ہم چھوٹے تھے اور اپنا بھلا بُرا سمجھنے سے قاصر تھے لیکن وہ بات ہمیں اب سمجھ میں آ گئی ہے کہ والدین کے فیصلے ہی میں بچوں کے لیے بھلائی چھپی ہوتی ہے۔ بچو! اتنے سال گزرنے کے بعد بھی ہمیں اس راز کا پتا نہیں چلا کہ وہ پُراسرار سایہ کس کا تھا؟ کسی جن بھوت کا یا پھر والدین کی نافرمانی کی سزا جو ہمارا پیچھا کر رہی تھی۔ ☆☆☆

کھوج لگائیے میں حصہ لینے والوں کے نام

منیر احمد، تلہ گنگ۔ مائرہ حنیف، بہاول پور۔ صبا ضیاء، اسلام آباد۔ جواد، کراچی۔ محمد ذیشان اصغر، مظفر گڑھ۔ عبدالسلام، بہاول پور۔ محمد اکرم، ہرنولی۔ علیین کشف، لاہور۔ محمد فراز معظم، ملتان۔ انعم مدثر، سیالکوٹ۔ اسجد کلیم بھٹہ، ڈیرہ غازی خان۔ سنیہ وجیہہ ضیغم، پشاور۔ زویا احمد، راول پنڈی۔ محمد علی قاسمی، وزیر آباد۔ وجیہہ شہباز، بورے والا۔ لیلیٰ جلیل، نوشہرہ۔ اسماء، سوہدرہ۔ محمد عثمان، وزیر آباد۔ حفصہ محمد، اسلام آباد۔ عتیق الرحمٰن، گجرات۔ زینب عظیم صدیقی، لاہور۔ سیدہ آمنہ فاطمہ، کراچی۔ عائشہ تبسم، محمد خبیب منیر، لاہور۔ محمد سلیم مغل، قصور۔ اریبہ نیازی، بھکر۔ محمد احمد خان غوری، بہاول پور۔ محمد طلال خان ناصر، گوجرانوالہ۔ سیف اللہ وڑائچ، قلعہ دیدار سنگھ۔ احمد عبداللہ، میانوالی۔ حفصہ عمران، لاہور۔ شارقہ عارف، راول پنڈی۔ محمد زین العابدین رمضان، فیصل آباد۔ سید محمد موسیٰ، کراچی۔ عادل آصف، منڈی بہاؤ الدین۔ لائبہ جمیل، بہاول پور۔ اسامہ ظفر راجا، سرائے عالم گیر۔ محمد وسیم مختار احمد، شکر گڑھ۔ عائشہ سلام، اسلام آباد۔ سیدہ آمنہ واسطی، کراچی۔ ارسلان احمد صدیقی، حیدر آباد۔ ذیشان احمد، کرک۔ اصغر علی، فیض علی، وزیر آباد۔ اقراء یعقوب، الہ آباد۔ سعیدہ فاطمہ، فیصل آباد۔ نمرہ فرید، ایمن اظہر، لاہور۔ بشریٰ صفدر، تلہ گنگ۔ عبداللہ مسعود، فیصل آباد۔ یمنہ خان، ایبٹ آباد۔ مشیرہ سلیمان بٹ، گوجرانوالہ۔ ناظرہ مقدس، شرق پور شریف۔ قاری محمد ندیم عطاری، اوکاڑہ۔ محمد عبداللہ ثاقب، پشاور۔ عبدالرحمٰن بٹ، سیال کوٹ۔ آمنہ وسیم، ایبٹ آباد۔ نفیسہ فاطمہ قادری، نور فاطمہ قادری، ثمن شہزادی قادری، محمد نبیل قادری، صدام حسین قادری، محمد عمر عطا قادری، نور حسین قادری، خدیجہ نشان، حلیمہ نشان، کاموکی

آپ بھی لکھیے

غلطی کا احساس

محمد معوذ الحسن، ڈیرہ اسماعیل خان

''لڑکے! تم کون ہو اور کہاں جا رہے ہو؟'' یہ آواز لمبے قد والے بارعب شخص نے دی۔

''میں امجد ہوں۔'' لڑکے نے پریشان ہوتے ہوئے اس شخص کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''گھر سے بھاگے ہو؟'' لمبے قد والے نے ایک دفعہ پھر کہا تو امجد خوف زدہ ہو گیا۔

''اس کی چوری پکڑی گئی تھی۔ وہ واقعی گھر سے بھاگا ہوا تھا کیوں کہ اس کا باپ اسے بُرے دوستوں کی صحبت میں بیٹھنے سے منع کیا کرتا تھا۔ اسے اسکول جانے کا کہتا تھا مگر امجد کو یہ سب نصیحتیں فضول لگتی تھیں۔ وہ زندگی کو ہنسی خوشی بسر کرنا چاہتا ہے۔ بغیر کسی پابندی کے زندگی بسر کرنا چاہتا تھا جو اس کے لیے بگاڑ کا باعث بن رہا تھا۔

آخر جب پانی حد سے گزر گیا تو اس کے والد نے اس کی پٹائی کی۔ وہ ناراض ہو کر گھر سے نکل پڑا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ اس نے کہاں جانا ہے۔ وہ چلتا جا رہا تھا کہ اسے ایک شخص نے دیکھ لیا۔ اب وہ خوف ناک نظروں سے گھور رہا تھا۔ پھر وہ آگے بڑھا اور امجد کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

''میرا نام ارباب ہے۔ میں تمہیں اپنے بیٹوں کی طرح سمجھتا ہوں۔ آؤ میں تمہیں کوئی ہنر سکھا دیتا ہوں جس سے تم اپنا کاروبار شروع کر لینا۔''

امجد چپ چاپ اس کے ساتھ چل پڑا۔ وہ امجد کو لے کر ایک سنسان علاقے کی طرف چل پڑا۔ تھوڑی دُور جانے کے بعد وہ ایک کوٹھی کے اندر چلے گئے۔ کھانا کھانے کے بعد ارباب نے امجد کو پینے کے لیے دودھ دیا۔ دودھ پیتے ہی امجد کو نیند آ گئی۔ جب امجد پوری طرح بے ہوش ہو گیا تو اس نے امجد کو کار میں ڈالا اور چل پڑا۔ وہ امجد کو کار میں لے کر شہر سے دُور ایک ویرانے کی طرف بڑھ رہا تھا کہ اچانک امجد کو ہوش آ گیا۔ اس نے اپنے ارد گرد کا جائزہ لیا اور کار میں موجود اس کے ساتھی کی باتیں سنیں تو اسے معلوم ہوا کہ اسے اغواء کر لیا گیا ہے۔ یہ معلوم ہونے کے بعد اس نے زور سے کہا ''آپ مجھے کہاں لے جا رہے ہیں؟''

''چپ کر جاؤ، ورنہ گولی مار دوں گا۔'' امجد کے ساتھی نے اسے ڈراتے ہوئے کہا مگر امجد نے اپنے حواس بحال رکھے اور بھرپور قوت سے اپنا ہاتھ شیشے پر دے مارا۔ شیشہ ٹوٹ چکا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی اس کا ہاتھ زخمی ہو چکا تھا۔ کار کے پیچھے ایک ویگن آ رہی تھی۔ لوگوں نے دیکھا کہ معاملہ گڑبڑ ہے تو انہوں نے ویگن کو کار کے آگے لا کھڑا کیا اور سڑک بلاک کر دی۔ ارباب پھرتی سے کار نکال کر فرار ہو گیا۔

امجد نے پھرتی سے چلتی کار سے دروازہ کھولا اور بھاگ کھڑا ہوا۔ لوگوں نے امجد کو اس کے گھر جانے والی بس میں بٹھا دیا۔

جب امجد گھر پہنچا تو اس کی گمشدگی کا اعلان ہو رہا تھا۔ جب وہ اپنے محلے میں داخل ہوا تو باپ نے بھاگ کر اپنے بیٹے کو سینے سے لگا لیا۔ امجد کو اپنی غلطی کا احساس ہو چکا تھا اور وہ اس تصور سے ابھی تک خوف زدہ تھا کہ اگر وہ کار سے فرار ہونے میں کام یاب نہ ہو پاتا تو اس کا کیا حشر ہوتا؟

پہلا انعام: 195 روپے کی کتب

کام یابی کا راز

محمد ارسلان ہاشم، کراچی

رات کے چار بج رہے تھے، علی اور نعمان دونوں پڑھائی کرنے میں مصروف تھے جب کہ رحمت نیند کے مزے میں تھا۔ صبح ان کا امتحان تھا۔ رحمت، علی اور نعمان تینوں ہم جماعت تھے اور آپس میں بہت اچھے دوست بھی تھے۔ تینوں ہر سال امتحان میں خوب دل لگا کر پڑھتے تھے۔ آج رحمت نے اپنی تیاری ایک بجے تک مکمل کر لی تھی جب کہ علی اور نعمان ہمیشہ کی طرح چار، پانچ بجے تک پڑھنے میں مصروف تھے۔ رحمت ہر سال اوّل پوزیشن لے کر کام یاب ہوتا جب کہ علی اور نعمان دوسری اور تیسری پوزیشن لینے میں کام یاب رہتے۔ تینوں ساتویں جماعت کے طلباء تھے۔ علی اور نعمان ہمیشہ رحمت سے آگے نکلنے کی کوشش کرتے لیکن رحمت اپنی پوزیشن برقرار رکھتا۔ آج بھی وہ دونوں ہمیشہ کی طرح پڑھنے میں مصروف تھے۔ ان تینوں میں ہمیشہ مقابلہ رہتا تھا۔

''چلو رحمت بیٹا اُٹھو، نماز کا وقت ہو چکا ہے۔'' رحمت کی امی

نے رحمت کو اُٹھاتے ہوئے کہا۔ رحمت نیند سے جاگ چکا تھا، وضو کر کے مسجد کی طرف روانہ ہو گیا۔ علی اور نعمان بھی وضو کر کے نماز کے لیے نکل چکے تھے۔ تینوں اپنے اپنے گھر کے نزدیک مسجدوں میں نماز پڑھ کر اپنے اپنے گھر روانہ ہو گئے اور اسکول جانے کی تیاریوں میں لگ گئے۔ اسکول جانے سے قبل تینوں نے اپنی اپنی کتابیں ایک بار پڑھ لیں اور اسکول کے لیے نکل گئے۔

''آج تو میں نے پیپر کی اچھی طرح تیاری کی ہے۔'' علی نے رحمت اور نعمان کو نیچا دکھاتے ہوئے کہا۔

''تو کیا ہوا، میں بھی پوری رات جاگا ہوں۔ میں نے بھی پوری تیاری کی ہے۔'' نعمان بھی علی کی بات سن کر بول پڑا۔ ''وہ تو رزلٹ کے وقت پتا چلے گا۔'' رحمت بھی دونوں کی بات سن کر اپنے آپ کو روک نہ سکا۔ ''چلو بچو پیپر آ چکے ہیں، خاموش ہو جاؤ سب۔'' ماسٹر صاحب نے تمام بچوں کی طرف مخاطب ہو کر کہا۔ تینوں نے اچھے طریقے سے پیپر دیا اور اسکول سے نکل رہے تھے۔

''چلو ہمارا آخری پیپر بھی ہو گیا۔'' علی نے خوش ہو کر رحمت اور نعمان سے کہا۔

''ہاں، اب رزلٹ کے وقت ملیں گے۔'' نعمان نے علی اور رحمت سے خدا حافظ کہا اور گھر کی طرف چل دیا۔ آج ان کا رزلٹ تھا تینوں وقت پر اسکول پہنچ گئے۔ اس بار بھی علی اور نعمان کا منہ بن گیا اور رحمت نے اوّل پوزیشن لی۔ علی نے دوسری جب کہ نعمان نے تیسری پوزیشن لی۔ علی اور نعمان کلاس کے باہر بیٹھے تھے، دونوں کے منہ پر اُداسی چھائی ہوئی تھی۔ ماسٹر صاحب نے ان کی اُداسی دیکھی تو فوراً بول پڑے۔ ''کیا ہوا تم دونوں اتنے اداس کیوں ہو؟ تم دونوں نے تو دوسری اور تیسری پوزیشن حاصل کی ہے نا؟'' ''ماسٹر صاحب، ہم ہر سال اچھے پیپر دیتے ہیں۔ پھر ہم اوّل کیوں نہیں آتے اور رحمت ہی ہر سال اوّل پوزیشن کیوں لیتا ہے؟'' علی نے غم زدہ لہجے میں پوچھا۔

''ہاں! ہم فجر تک جاگتے ہیں اور پڑھتے ہیں جب کہ رحمت جلدی سو جاتا ہے، اس کے باوجود ہم دوسری اور تیسری پوزیشن لیتے ہیں۔'' نعمان نے بھی دکھ بھرے لہجے میں ماسٹر صاحب سے پوچھا۔

ماسٹر صاحب مسکرا دیئے اور بولے: ''اچھا تو تم یہ جاننا چاہتے ہو کہ رحمت ہر سال اوّل کیوں آتا ہے؟ وہ اس لیے کہ جو میں پورا سال تمہیں لکھاتا ہوں، رحمت وہ نہیں لکھتا بلکہ وہ اپنے دماغ سے پورا پیپر حل کرتا ہے۔ ہر مضمون اپنی مرضی سے بناتا ہے اور جوابات کو اپنے الفاظ میں بیان کرتا ہے، اس لیے وہ ہر سال تم سے اچھے نمبر لیتا ہے اور تم لوگ وہی سب رٹتے ہو جو میں لکھاتا ہوں اپنے دماغ کا استعمال نہیں کرتے۔'' علی اور نعمان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ علی اور نعمان نے بھی رحمت کی طرح پڑھنا شروع کر دیا اور صبح خیزی کی عادت اپنا لی۔ انہیں کامیابی کا راز مل گیا تھا۔

دوسرا انعام: 175 روپے کی کتب

پوسٹر

مریم اعجاز، لاہور

''روہان! کیا کر رہے ہو؟'' روہان کے ابو اندر داخل ہوتے ہوئے بولے۔ ''کچھ نہیں! بس آخری مضمون کا کام کر رہا تھا۔'' روہان نے کام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''اچھا! لاؤ میں کرا دوں۔'' ابو پیار سے بولے۔ ''اچھا!'' روہان نے کہا اور کتابیں اُٹھا کر ابو کے پاس آ گیا۔

''ارے یہ کیا! تم اسلامیات اور اُردو کی کتاب زمین پر رکھ کر کام کر رہے تھے۔ کیا تمہیں پتا نہیں کہ ان کتابوں میں اللہ رسولؐ، صحابہ کرامؓ اور انبیاء کرامؑ کے نام لکھے ہوتے ہیں۔ ان میں قرآنی آیات اور احادیث بھی لکھی ہوتی ہیں۔ تم اب چوتھی جماعت میں پڑھتے ہو۔ ان باتوں کا علم تو ہونا چاہیے۔ صرف اُردو اور اسلامیات کی ہی کتابوں پر نہیں بلکہ اکثر کتابوں کے شروع میں بسم اللہ لکھی ہوتی ہے۔ اس طرح ان کی بے ادبی ہوتی ہے۔ آئندہ احتیاط کرنا۔'' ''اچھا ابو! میں آئندہ اس کا خیال رکھوں گا۔'' زبیر نے معصومانہ انداز میں کہا۔

روہان کے والد کا بہت بڑا پرنٹنگ پریس تھا۔ وہ ہر قسم کے پوسٹر بھی چھاپتے تھے۔ اگلے دن روہان نے اپنی اُستانی کو اپنے والد کی باتیں بتائیں۔

''بالکل بیٹا! اکثر لوگ اس بات کو معمولی سمجھتے ہیں مگر یہ بہت بڑی نیکی ہے۔ شاباش بیٹے! آپ کے والد نے آپ کو واقعی بہت اچھی بات بتائی ہے۔'' استانی صاحبہ نے پیار سے کہا۔

کچھ دنوں بعد اسکولوں میں چھٹیاں ہوئیں۔ ایک دن روہان نے ابو سے پریس جانے کی خواہش کی۔

جب وہ پریس پہنچے تو روہان کے ابو جلدی جلدی ملازمین کو

ہدایت دینے لگے۔ روہان دیکھ رہا تھا کہ مشین میں کاغذ ڈالتے ہی دوسری طرف سے نکلے جا رہا ہے۔ اس نے دیکھا کہ پوسٹر فرش پر بکھرے ہیں۔ اس پر آپؐ کا نام لکھا ہے۔ اس کے دماغ میں کئی سوال پیدا ہوئے۔ گھر آ کر اس نے اپنے والد سے بات کی۔ اس کے والد نے کہا: ”بیٹا! کام ہو رہا تھا اس لیے ایسا کرنا پڑا۔“

روہان نے پوچھا: ”ابو کیا کام کرتے وقت اس کا گناہ نہیں ہوتا؟“ اس کے والد لاجواب ہو گئے۔ انہوں نے کہا: ”بیٹا! ایسا نہیں۔ اصول تو ایک ہی ہوتا ہے مگر ہم جلد بازی میں ان چیزوں کا خیال نہیں رکھتے۔“ انہوں نے روہان کو گلے لگایا۔

روہان نے ایک اہم بات کی طرف توجہ دلا کر مقدس اوراق کی بے حرمتی سے بچا لیا۔

تیسرا انعام: 125 روپے کی کتب

حقیقی برتری

رابعہ اکرام، لاہور

فرخندہ بیگم کا تعلق ایک امیر گھرانے سے تھا۔ زندگی کی ہر آسائش ان کے گھر میں موجود تھی مگر اس کے باوجود وہ نہ تو تکبر زدہ تھیں اور نہ ہی اسراف پسند۔ وہ امیر طبقہ سے تعلق رکھتی تھیں مگر ان کے گھر کا فرنیچر و دیگر اشیاء وقت کے ساتھ تبدیل نہیں ہوتی تھیں۔ وہ ہر چار یا چھ مہینے بعد نیا فرنیچر بنوانے کی بجائے کسی غریب کی مدد کرنا پسند کرتی تھیں۔ شائستہ ان کی اکلوتی بیٹی تھی جو کہ خود پسند اور دکھاوا کرتی تھی۔ شائستہ کے والد کاروباری سلسلہ میں اکثر گھر سے باہر ہی رہتے تھے۔ چونکہ شائستہ دکھاوا کرتی تھی اسی وجہ سے وہ کوئی ایسا موقع نہیں جانے دیتی تھی جس میں وہ دکھاوا کر سکے۔

اسکول میں اگلے مہینے مینا بازار تھا اور شائستہ کی پوری کوشش تھی کہ وہ مہنگا ترین لباس خریدے تا کہ ہر کوئی اس کی تعریف بھی کرے اور اس سے متاثر بھی ہو لیکن اصل مسئلہ اپنی والدہ کو منانا تھا کیوں کہ فرخندہ بیگم ایسی ہرگز نہیں تھیں کہ بیٹی کی ہر خواہش کو آنکھیں بند کر کے پورا کر دیں۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ شائستہ عیش و عشرت میں مبتلا ہو۔ بہت ہمت کر کے وہ فرخندہ بیگم کے پاس گئی اور نئے لباس کا مطالبہ کیا۔

”لیکن بیٹی! آپ کے پاس تو پہلے ہی کئی نئے لباس ہیں جنہیں آپ نے ایک سے زیادہ دفعہ نہیں پہنا تو آپ انہی میں سے کوئی کیوں نہیں پہن لیتیں۔“ فرخندہ بیگم نے کہا۔

”امی، سارہ آج کہہ رہی تھی کہ میں نے بہت اچھا لباس خریدا ہے جسے دیکھ کر سب دم بخود رہ جائیں گے، میں اس سے زیادہ بھی قیمتی لباس لینا چاہتی ہوں تا کہ سب میری ہی طرف متوجہ ہوں اور میری ہی تعریف کریں۔“ شائستہ نے وضاحت کی۔

”بیٹی! آپ نے کبھی اس بات پر غور کیا ہے کہ اللہ نے آپ کو تمام نعمتوں سے نوازا ہے مگر دُنیا میں اکثر لوگ ایسے بھی ہیں جو ایک ایک نعمت کو ترستے ہیں۔ آپ کو تو ہر لمحہ اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ فرمان الٰہی ہے کہ ”بے شک نیک لوگ بڑے مزے میں ہوں گے۔ ان کے چہروں پر تم خوش حالی کی رونق محسوس کرو گے۔ ان کو نفیس ترین سر بند شراب پلائی جائے گی جس پر مشک کی مہر لگی ہو گی۔ جو لوگ دوسروں پر بازی لے جانا چاہتے ہیں وہ اس چیز کو حاصل کرنے میں بازی لے جانے کی کوشش کریں۔ (المطففین آیت 27-22)

فرخندہ بیگم کی اس بات نے اس کے دل پر اتنا اثر کیا کہ اس نے لوگوں پر خود کو برتر ثابت کرنے کی بجائے ان کو بھی اپنے ساتھ خوشیوں میں شامل کرنے کے متعلق سوچنا شروع کر دیا۔

چوتھا انعام: 115 روپے کی کتب

علم کی شمع سے ہو مجھ کو محبت یا رب

دعا فاطمہ، ایبٹ آباد

”تمہارے آٹھویں کے امتحانات ختم ہو گئے ہیں؟“ اماں نے دال صاف کرتے ہوئے پوچھا۔ ”جی اماں! ختم ہو گئے ہیں۔ ماشاء اللہ پیپر بہت اچھے ہوئے ہیں۔“ اُجالا نے جواب دیا۔ ”چلو اچھا ہوا۔ اب گھر بیٹھ کر میرا ہاتھ بٹانا۔“ اماں بولیں۔ ”مگر اماں! ابھی تو نویں اور دسویں رہتی ہے اور صدف باجی بتا رہی تھیں کہ ابھی کالج بھی بنے گا۔“ اُجالا نے کہا۔ ”بس بس! حالات دیکھے ہیں؟ وہ بدمعاش پورے گاؤں پھیل چکے ہیں۔ پہلے بھی اسکول اتنی مشکل سے بنایا اب کالج کیا بنائے گا۔ تمہارے ابا نے تو کچھ نہیں بتایا۔“ اماں بولیں۔ ”نہیں اماں میں پڑھوں گی۔ میں ان کی سازشوں کو ناکام بناؤں گی۔ اُستانی بن کر لڑکیوں کو پڑھاؤں گی۔“ اُجالا نے کہا۔ ”اس گاؤں میں کیا تعلیم حاصل کروں گی؟ اُستانی کیا خاک بنو گی۔ کیا فائدہ ہو گا اتنا پڑھ کر۔ اپنا فرہاد ماشاء اللہ چھٹی پاس ہے۔ شہر گیا تھا نوکری کرنے۔ دیکھو ہمیں پیسے بھجوانے پڑتے ہیں۔ توبہ کرو بی بی توبہ۔“ نسرین پھوپھی بولیں جو ابا کی کوئی دُور کی رشتہ دار تھیں۔ ان کا ایک ہی بیٹا تھا فرہاد۔ وہ نوکری کے بہانے

شہر گیا اور ہر مہینے انہیں اسے پیسے بھیجنے پڑتے۔ شوہر کچھ کام نہ کرتا تھا۔ تھوڑی سی زمین سے گزارہ ہو رہا تھا۔ ''آج کل شہر میں بارہویں پاس والے کو کوئی نہیں پوچھتا۔ فرہاد بھائی تو صرف چھٹی پاس ہیں۔'' اُجالا نے جواب دیا۔ ''ہاں! ہاں بس! تم نے آٹھویں کیا پاس کر لی بہت زبان چلنے لگی ہے۔'' نسرین پھوپھو یہ کہہ کر چل دی۔ ''اماں! میں خود ابا سے بات کرلوں گی۔'' اُجالا جو کافی دیر سے خاموش تھی بول پڑی۔ ''ہاں ہاں کہہ دینا اپنے ابا سے بھی۔'' اماں نے جواب دیا۔

اُجالا گاؤں میں رہتی تھی۔ اس کے ابا ٹھیکیدار صاحب کے ساتھ خاص ملازم ہوتے تھے۔ شہر آنا جانا اور کام دیکھنا ان کے ذمہ تھا۔ ٹھیکیدار صاحب بہت اچھے آدمی تھے۔ اُجالا سے بڑی دو بہنیں تھیں جن کی شادی ہو چکی تھی۔ اُجالا جب سات سال کی تھی تو اس کو فرہاد بھائی نے علامہ اقبالؒ کی نظم ''لب پہ آتی ہے دعا'' سنائی۔ اس کے دل میں تعلیم حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ اس نے ابا سے بات کی تو انہوں نے اپنی بیٹی کی خواہش ٹھیکیدار صاحب کے آگے رکھی۔ ٹھیکیدار صاحب بھی لڑکیوں کی تعلیم کے حق میں تھے۔ انہوں نے ایک اسکول تعمیر کروایا۔ اُجالا نے بہت شوق سے آٹھویں تک پڑھا۔ وہ بہت ذہین اور لائق ثابت ہوئی لیکن جب سے لڑکیوں کا اسکول تعمیر ہوا، زمیندار اشرف جو کہ لڑکیوں کی تعلیم کے خلاف تھا ٹھیکیدار صاحب کو دھمکانے کی کوشش کی مگر وہ پیچھے نہ ہٹے۔ ان کا یہی ارادہ تھا کہ آگے کالج بھی بنے گا کیوں کہ لڑکیاں تو شہر جا کر کالج نہیں پڑھ سکتیں۔

''ابا آپ سے ایک بات کرنی ہے۔'' اُجالا بولی۔ ''ہاں، بولو کیا بات ہے؟'' ابا نے ہاتھ دھوتے ہوئے کہا۔ ''ابا میں مزید تعلیم حاصل کرنا چاہتی ہوں۔'' اُجالا بولی۔ ''چاہتا تو میں بھی ہوں بیٹا لیکن ان بدمعاشوں کی دھمکیوں میں دن بدن اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔'' ابا بولے۔ ''مجھے معلوم ہے، میں ان کے اس مشن کو ناکام کرنے کے لیے آگے پڑھوں گی۔'' اُجالا بولی۔ ''میں نے سنا ہے کہ اسکول میں لڑکیوں کی تعداد کم ہو رہی ہے۔ تم اکیلی کیسے پڑھو گی۔ وہ کہیں ٹھیکیدار صاحب کو نقصان نہ پہنچائیں۔'' ابا پریشانی سے بولے۔ ''نہیں ابا میں سمجھاؤں گی سب کو وہ ضرور آئیں گی۔'' اُجالا جوش سے بولی۔ ''ٹھیک ہے بیٹا جیسی تمہاری مرضی۔'' ابا بولے۔

اُجالا کے میٹرک کے امتحانات ختم ہوئے۔ اس دوران زمیندار اشرف کے بندوں نے اُجالا کے ابا اور ٹھیکیدار صاحب کو بہت تنگ کیا۔ اب کالج کی تعمیر بھی تقریباً مکمل ہوگئی تھی۔ ایک دن زمیندار اشرف کے بندے ابا جان اور ٹھیکیدار صاحب کو گولی مار کر فرار ہو گئے۔

اُجالا کے ابا کے انتقال کو تین ماہ گزر گئے۔ اماں کو کچھ ہوش ہی نہ تھا۔ اُجالا نے ہمت نہ ہاری۔ وہ ایک ہفتے سے پُرانی حویلی کے پیچھے صحن میں بیٹھ کر بچیوں کو تعلیم دیتی کیوں کہ اسکول اور کالج پر ان بدمعاشوں کا قبضہ تھا۔ اُجالا کا مشن کام یاب ہو رہا تھا۔ ایک دن اُجالا بچیوں کو پڑھا کر واپس آ رہی تھی کہ دو آدمی موٹر سائیکل پر سوار تھے۔ ایک نے گولی چلائی اور اُجالا کے سینے میں جا کر لگی تھی۔ اسی جگہ پر جہاں اسے فرہاد بھائی نے نظم سنائی تھی۔ اُجالا جیت گئی تھی۔ اس کا مشن آج بھی چل رہا ہے اور علم کی شمع اندھیرے دُور کر رہی ہے۔

(پانچواں انعام: 95 روپے کی کتب)

اہم معلومات

☆ دُنیا کا سب سے بڑا شہر نیویارک ہے۔
☆ سب سے کم سونے والا جانور ہاتھی ہے۔
☆ ناروے میں آدھی رات کو بھی سورج چمکتا ہے۔
☆ دُنیا میں بہترین یاقوت، زمرد اور ہیرا کشمیر میں پایا جاتا ہے۔
☆ کوے کی آمد آسٹریلیا میں موت کی خبر، نیوزی لینڈ میں شادی کا پیغام اور پاکستان میں مہمان کی آمد سمجھی جاتی ہے۔
☆ پھولوں کا ملک ہالینڈ کو کہا جاتا ہے۔
☆ پاکستان کا قدیم شہر ملتان ہے۔ (محمد شکیب مسرت، بہاول پور)

☆ چیتا 60 میل فی گھنٹہ جب کہ گھوڑا زیادہ سے زیادہ 43 میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دوڑنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔
☆ ایک انسان کے فنگر پرنٹس دوسرے انسان سے نہیں ملتے۔
☆ ایک مکمل انسانی جسم میں اوسطاً 12 گیلن پانی موجود ہوتا ہے۔
(انعم محمد حنیف، کراچی)

☆ سردیوں میں سورج زمین کے سب سے زیادہ نزدیک ہوتا ہے۔
☆ ماہرین فلکیات کے مطابق کائنات کی عمر دس بلین سال ہے۔
☆ ہم جس کہکشاں میں رہتے ہیں اس کا نام آکاس گنگا (Milky Way) ہے۔ (عمران سردار، ساہی وال)

ہمارے گھر میں بلی اپنے چار بچے لے آئی تھی جو کہ ہر وقت اِدھر اُدھر گھومتے پھرتے اور میاؤں میاؤں کرتے رہتے۔ بلی ہر وقت اپنے بچوں کے قریب ہی رہتی تھی۔ اس کے بچے جیسے ہی کہیں اس کی نظروں سے دُور ہوتے تو وہ زور زور سے چیخ کر انہیں اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کر دیتی۔ احمد اور خیر محمد کی جان تو ان بچوں میں تھی۔ وہ فراغت کے اوقات میں ان کے ساتھ کھیلتے رہتے، جب وہ چھوٹے تھے تو اس قدر پریشان نہیں کرتے تھے مگر اب جیسے جیسے بڑے ہوتے جا رہے تھے، ہر چیزوں میں گھستے جاتے تھے۔ آپی سامیہ تو بلی اور اس کے بچوں سے خوف کھاتی تھیں اور اگر کوئی بلی کا بچہ وہ صحن یا کچن میں دیکھ لیتیں تو باہر نہیں نکلتی تھیں جب کہ بلی نے گھر میں الگ گندگی کرنا اور چوہے لانا شروع کر دیئے تھے جس سے جگہ جگہ تعفن اُٹھنے لگا تھا۔ دونوں بڑے بھائی، علی اور فہد بلی اور اس کے بچوں سے گھن کھاتے تھے۔ وہ کئی بار ابو سے شکایت کر چکے تھے مگر ایک روز تو بلی کے بچوں نے حد ہی کر دی۔ امی نے دودھ گرم کرنے کے لیے چولہے پر رکھا ہی تھا کہ بلی کے بچوں نے وہ گرا دیا۔ یوں دودھ کو ضائع ہوتا دیکھ کر امی غصے سے آگ بگولہ ہوتے ہوئے چیخیں۔

''ارے غضب خدا کا، کم بختوں نے سارا دودھ گرا دیا...... اب بچوں کا ناشتا کیسے ہوگا..... کیا بھوکے اسکول جائیں گے؟'' امی کی آواز سنتے ہی علی، فہد اور ابو بھی کمرے سے دوڑے چلے آئے۔

''اوہو! یہ کیسے ہوا.....؟'' ابو نے افسردگی سے پوچھا۔

''بلی کے بچوں نے گرا دیا ہے..... گھر میں کیا کم مصیبتیں ہیں جو یہ مصیبت اور آ گئی ہے۔ میں پہلے دن ہی سے کہہ رہی تھی کہ انہیں نکال پھینکیں مگر آپ نے ایک نہ سنی دیکھ لیں انجام.....''

''ابو بلی نے سارے گھر کو کباڑ خانہ بنا دیا ہے۔ مرے ہوئے جانور اور چوہے لانا شروع کر دیئے ہیں۔ صفائی کر کر کے میں پاگل ہو گئی ہوں۔ پلیز! کچھ کریں۔'' سامیہ آپی نے رونی سی صورت بناتے ہوئے اپنے ابو سے کہا۔

''سنو! میں بھی ان سے پریشان ہوں مگر ابھی اس کے بچے چھوٹے ہیں، اسی لیے انہیں کہیں چھوڑ کر آنے سے ڈر لگتا ہے۔''

''ابو! اب وہ بچے نہیں رہے، بڑے ہو گئے ہیں۔ سارے گھر میں دوڑتے اور نقصان کرتے رہتے ہیں۔'' سامیہ آپی نے اپنے ابو کو بتایا۔

''تو پھر ٹھیک ہے علی اور فہد تم بلی اور اس کے بچوں کو کہیں ایسی جگہ چھوڑ آؤ جہاں انہیں گوشت اور محفوظ جگہ میسر ہو۔'' اس روز خیر محمد اور حشام وہیں کھڑے یہ تمام باتیں سن رہے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ بلی کے بچے ابھی بہت چھوٹے ہیں۔ وہ ابھی صرف اپنی ماں کا دودھ پیتے ہیں اور اگر بچوں کو ماں سے یا ماں کو بچوں سے الگ کیا گیا تو وہ

مر جائیں گے۔ انہوں نے یہی بات اپنی امی اور آپی سامیہ سے بھی کہی مگر کسی نے ان کی ایک نہیں سنی۔ آخر دوسری شام ہی بلی کے چاروں بچوں کو دونوں بڑے بھائیوں نے بڑی مشکل سے پکڑا اور ایک تھیلے میں ڈال دیا مگر بلی ان کے قابو میں نہیں آئی اور بھاگ گئی۔ خیر اسی وقت ان دونوں بھائیوں نے ان بلی کے بچوں کو لیا اور گوشت مارکیٹ کی طرف روانہ ہو گئے جو کہ تھوڑی ہی دُور تھی۔ خیر محمد اور حسام اپنے بھائیوں کے اس طرزِ عمل سے خوش نہیں تھے۔ وہ جانتے تھے کہ وہ ٹھیک نہیں کر رہے مگر وہ دونوں بہت مجبور تھے اور کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ بچوں کو ان کی ماں سے الگ کیا جائے۔ وہ اپنے بھائیوں کو روک تو نہیں سکتے تھے مگر یہ ضرور کر سکتے تھے کہ بچوں کو ماں کے ساتھ ہی کسی محفوظ جگہ پر منتقل کر دیا جائے۔ یہی سوچ کر وہ دونوں بھائی بھی اپنے بڑے بھائیوں کے پیچھے پیچھے خاموشی سے چلتے رہے۔ کافی دُور تنگ گلیوں سے نکلنے اور پیدل چلنے کے بعد وہ آخر گوشت مارکیٹ پہنچ گئے۔ پھر انہوں نے چپکے سے وہ تھیلا اوندھا کر دیا جس میں سے وہ چاروں بچے نکل کر اِدھر اُدھر دوڑ گئے۔ ان دونوں بھائیوں نے یہ کام بہت جلدی کیا تھا اسی لیے وہ فارغ ہوتے ہی فوراً وہاں سے چل دیئے۔

حسام اور خیر محمد ان تمام معاملات کو دُور کھڑے ہو کر دیکھ رہے تھے۔ جب دونوں بڑے بھائی واپس گھر کی طرف روانہ ہو گئے تو یہ دونوں فوراً وہاں پہنچے اور ان بلی کے بچوں کو واپس لے جانے کے لیے انہیں آواز دے کر بلانے لگے۔ وہ چاروں معصوم بچے ایک مصیبت سے تو ابھی نکلے تھے، اس لیے بے انتہا خوف زدہ تھے اور کسی طرح بھی قابو میں نہیں آ رہے تھے۔ اسی خوف کے عالم میں بلی کے دو بچے تو نالی میں بھی گر گئے تھے جنہیں حسام نے بڑی مشکل سے نکال لیا تھا۔ بلی کے بچوں کو واپس پکڑنے میں انہیں بہت دیر ہو گئی تھی اور دوسری مصیبت یہ ہوئی کہ واپسی پر لائٹ چلی گئی۔ ان دونوں بھائیوں کو واپسی کا راستہ معلوم تو تھا مگر لائٹ جانے سے وہ دونوں معصوم بچے راستہ بھول گئے۔

رات عشاء نماز کے بعد تک جب دونوں چھوٹے بھائی گھر نہیں پہنچے تو امی ابو پریشان ہو گئے، ایسا پہلے کبھی بھی نہیں ہوا تھا۔ پہلے تو انہیں ادھر پڑوس میں ڈھونڈا مگر جب وہ وہاں نہیں ملے تو ان کے چچا اور ماموں کے گھر میں ڈھونڈا مگر وہ کہیں بھی نہیں ملے۔ اب تو سب کی فکر تشویش میں بدل گئی تھی۔ جب کافی دیر تک ان کا کہیں پتا نہیں۔ چلا تو گھر اور محلے والے ان بچوں کو ڈھونڈنے کے لیے نکل گئے، جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا تھا ایسے ہی سب کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ پھر کسی کے کہنے پر مسجد سے دو بچوں کی گم شدگی کا اعلان بھی کرا دیا گیا مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔

اب تو گھر میں رونا پیٹنا مچ گیا تھا جب کہ بلی بھی اپنے بچوں کے غم میں بار بار آتی اور انہیں نہ پا کر آوازیں دیتی رہتی۔ اس کا اور خیر محمد کی امی کا غم سانجھا تھا۔ کافی دیر بعد گلی میں ایک صاحب اپنی موٹر سائیکل پر داخل ہوئے ان کے پیچھے خیر محمد اور حسام سہمے ہوئے بلی کے بچوں کو لیے ہوئے بیٹھے تھے۔ جیسے ہی کسی کی نظر ان دونوں بھائیوں پر پڑی، اس نے چیخ کر اعلان کر دیا۔ ''خیر محمد اور حسام آ گئے۔'' آواز سنتے ہی امی ابو دروازے کی طرف دوڑے، لمحوں میں گلی میں لوگوں کا رش لگ گیا۔ امی نے تو آتے ہی اپنے دونوں بچوں کو گلے لگا کر خوب پیار کیا اور خوشی سے روتے ہوئے بولیں۔

''کہاں چلے گئے تھے آپ دونوں......''

''بھائی صاحب......'' بچوں کو اپنے ساتھ لانے والے صاحب نے ان کے ابو کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ مجھے گوشت مارکیٹ کے پاس بلی کے بچوں کو پکڑتے ہوئے ملے تھے اور کہہ رہے تھے کہ ان کے بھائی بلی کے بچوں کو ان کی ماں سے جدا کر کے یہاں چھوڑ گئے ہیں، اگر انہیں ان کی ماں کے پاس یا ساتھ نہیں رکھا گیا تو یہ مر جائیں گے۔ ان کی صلہ رحمی قابلِ ذکر ہے اور ہمت قابلِ رشک۔ لائٹ جانے پر یہ راستہ بھول گئے تھے، آپ نے انہیں ڈانٹنا نہیں کیوں کہ یہ ایک اچھا کام کر کے آئے ہیں۔''

''آپ نے درست فرمایا...... ہم سب آپ کے تہہ دل سے مشکور ہیں، انجانے میں ہم سب سے غلطی ہو گئی...... جو کام ہمیں کرنا تھا، انہوں نے کر دکھایا۔'' یہ کہتے ہی ابو نے بھی اپنے بچوں کو پیار کیا جس سے ان دونوں کا خوف کم ہو گیا۔ اتنے سارے لوگوں کے بیچ بلی بھی اپنے بچوں کو پکار رہی تھی۔ بلی کی آواز سنتے ہی خیر محمد اور حسام سے چاروں بچے لے کر ان کے امی ابو نے نیچے زمین پر رکھ دیئے تو وہ بھاگم بھاگ اپنی ماں کی طرف لپکے۔ ماں شدت محبت سے انہیں چاٹنے لگی اور حسام کے امی ابو کی طرف ایسے دیکھنے لگی کہ جیسے انہیں دُعا دے رہی ہو۔ ☆☆☆

صالحہ محبوب

کچھ تو کرو

درد کی شدید لہر نے زور وشور سے بلا گھماتے یاسر کو بے چین کر دیا۔ اس کا ہاتھ بے اختیار اپنی کمر اور ریڑھ کی ہڈی کی جانب گیا۔ جانے کیا ہوا تھا؟ وہ اپنی کراہوں پر بند باندھتے پیٹھ سہلانے لگا مگر درد کی دوسری لہر نے گویا اسے جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ کرکٹ کا بلا اس کے ہاتھ سے گر گیا۔ بے حد شدید درد وقفے وقفے سے ہو رہا تھا اور اب اس کی شدت ناقابلِ بیان تھی۔

''یاسر! ایسے کیوں بیٹھے ہو؟ خیریت...... کیا ہوا؟ طبیعت تو ٹھیک ہے ناں!'' امی جو یاسر کے جانے کے بعد گیٹ بند کرنے آ رہی تھیں، اسے کرسی پر بیٹھ کر ہائے ہائے کرتا دیکھ کر گھبرا ہی گئیں۔

''امی میری کمر میں بہت درد ہو رہا ہے۔'' یاسر اپنے آنسو ضبط کرتا ہوا بولا۔

''بیٹا! یقیناً آپ نے آج اسکول سے کچھ اُلٹا سیدھا کھایا ہو گا۔'' امی نے جھٹ نتیجہ اخذ کر کے اپنا اندازہ لگا لیا۔

''امی! میں نے کہیں سے کچھ نہیں کھایا۔ آج تو دوپہر کا کھانا آپ سب کے ساتھ کھایا ہے اور درد بھی پیٹ میں نہیں، کمر میں ہو رہا ہے۔'' یاسر خفگی سے بولا۔

''یہ منحوس بیٹ اور گیند بھی بچوں کے لیے بُری ہے۔ اتنا بڑا بلا لے کر کھیلنے سے کمر میں جھٹکا آ گیا ہو گا۔'' امی نے فوراً دوسری تشخیص کی۔

''امی! یہ بلا میں نے ابھی ابھی اُٹھایا ہے بلکہ ابھی تو اس سے کھیلنا شروع بھی نہیں کیا۔ آپ یوں کریں مجھے کوئی دوا لا دیں۔'' یاسر، امی سے بولا۔

ہاں! ہاں! دوا لا دوں...... درد کہاں ہے، کیوں ہے؟ کیسے ہوا؟ اور دوا لا کر دے دوں۔ تم یوں کرو سیدھے کھڑے ہو تاکہ اندازہ ہو سکے کہ کہیں چک تو نہیں آ گئی۔ امی نے پیار سے یاسر کو کھڑا ہونے کے لیے کہا۔ یاسر کا درد سے بُرا حال ہو رہا تھا۔ امی کے کھڑا کرنے پر وہ بمشکل کھڑا ہوا۔ امی نے اسے جھکا کر اور پھر سیدھا کر کے تسلی کی کہ کمر میں چک کا کوئی مسئلہ نہیں ہے مگر یاسر کی کمر میں ہنوز شدید تکلیف تھی جو لمحہ بہ لمحہ زیادہ ہوتی جا رہی تھی۔

کچھ ہی دیر میں امی کے ساتھ ساتھ ابو جان، دادا جان اور دادی جان سب ہی اکٹھے ہو چکے تھے۔ اب چاروں طرف سے تشخیص بھی ہونے لگی اور ٹوٹکے بھی بتائے جانے لگے۔ تمام افرادِ خانہ اس ایک نکتے پر متفق تھے کہ یاسر کے اسکول کی کینٹین میں نہایت گندی چیزیں ملتی ہیں، یہ الگ بات تھی کہ روز چاروں ہی ایک دوسرے سے چھپا کر یاسر کو جیب خرچ دیا کرتے تھے۔

''امی...... چھوڑیں کینٹین کو...... کوئی درد کی دوا دیں۔'' یاسر ہلکی سی آواز میں بولا مگر اب تک چاروں بزرگ اپنی بحث میں مصروف

تھے۔ دادا جان سب کو غیر ذمہ دارانہ رویوں پر لیکچر دے رہے تھے اور دادی انہیں دو بدو جواب دے رہی تھیں۔ ابو جان یاسر کے کھانے پینے کے طور طریقوں سے نالاں تھے تو امی سب کے بے جا لاڈ پیار سے، آخر یاسر گھر بھر کا اکلوتا اور لاڈلا بچہ جو تھا۔ دادا جان کو بالآخر یاسر کا خیال آ ہی گیا۔ ''بیگم اسے میری دواؤں میں سے درد کی گولی دے دو۔''

''ارے کمال کرتے ہیں آپ...... بچے کو بزرگ کی دوا کیسے دی جا سکتی ہے۔ دادی جو خود بھی کالج میں پڑھاتی تھیں، فوراً بولیں۔

''اچھا میری نہ سہی اپنی میں سے دے دو۔'' دادا جان اس وقت پوتے کی تکلیف دیکھتے ہوئے صلح کے موڈ میں تھے ورنہ اس بات پر عالمی جنگ شروع ہو چکی ہوتی۔

''ہاں! ہاں! آپ تو بزرگ ہیں اور میں بچی کہ میری دوا بچہ کھا کر بھلا چنگا ہو جائے گا۔'' دادی خفا ہونے لگیں۔

دادا جان ایک معروف صحافی اور اُستاد تھے۔ دادی کی رائے میں ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد انہوں نے معروف تجزیہ نگار اور صحافی زبردستی نام کے ساتھ لگا لیا ہے۔ ورنہ موصوف گھر کے حالات کا جائزہ لینے سے قاصر تھے، بھلا ملکی حالات کا تجزیہ کیسے کرتے؟

''دادی جان! بہت درد ہو رہا ہے۔'' یاسر اب پھوٹ پھوٹ کے رو دیا۔ گو وہ جب سے دسویں جماعت میں آیا تھا۔ رونا دھونا چھوڑ دیا تھا مگر آج یہ درد ناقابلِ برداشت تھا۔

''آپ سب اپنی باتیں چھوڑیں یاسر کو اسپتال لے چلتے ہیں۔'' اب امی پریشان ہو گئیں۔

''بیگم کوئی درد کی گولی تو دے دو، پھر چلتے ہیں۔'' ابو جان پر بھی یاسر کے آنسو خاصا اثر کر رہے تھے۔ یاسر کی امی جلدی سے درد کا سیرپ لے آئیں۔ ابو کمر کی مالش کرنے کے لیے بام لے آئے تو دادا جان درد ختم کرنے کا اسپرے۔ دادی دعائیں پڑھ پڑھ کر یاسر پر پھونک رہی تھیں۔ یاسر سب کی جان بھی تو تھا۔

اسے اندر کمرے میں کمبل اوڑھا کر لٹا دیا گیا۔ سب بڑے اس کے گرد ہی آن بیٹھے۔ یاسر کو ہلکی سی نیند آنے لگی مگر یہ غنودگی بہت تھوڑی دیر کے لیے تھی۔

''امی!'' اس کی چیخ نے سب کو ہوشیار کر دیا۔ امی درد ہو رہا ہے اور ساتھ ہی اسے متلی اور قے شروع ہو گئی۔

''ڈاکٹر کو گھر بلا لیتے ہیں؟'' دادا جان نے تجویز دی۔ ''نہیں، اسے اسپتال لے جانا زیادہ بہتر رہے گا۔'' اب دادی نے رائے دی۔ ابو گاڑی کی چابی لینے اندر چل دیئے۔ یاسر کو امی جان سہارا دے کر باہر لے آئیں۔ گھر سے نزدیک ترین اسپتال سرکاری اسپتال ہی تھا۔ گو صفائی کی صورت حال خراب تھی مگر وہاں کے ڈاکٹر بے حد قابل اور اچھے تھے۔ دس منٹ میں چاروں بڑے یاسر کو ساتھ لیے اسپتال چل دیے۔

اسپتال میں خاصا رش تھا۔ بے شمار مریض اور ان کے لواحقین۔ یاسر کو ایک اسٹریچر پر ڈال کر اندر لے جایا گیا۔ ایک ڈاکٹر اور دو نرسوں نے یاسر کو دیکھا، اس کے فوری ٹسٹ لیے اور پھر ایک ٹیکہ لگا دیا۔ یاسر کو یوں لگا جیسے درد کی لہر میں ایک دم کمی ہونے لگی۔ اس پر سکون سا طاری ہونے لگا اور رفتہ رفتہ وہ نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

جانے کتنی دیر بعد اس کی آنکھ کھلی۔ وہ ایک چھوٹے سے کمرے میں تھا۔ فضا میں دواؤں اور ڈیٹول کی ملی جلی بو بسی تھی۔ سامنے بینچ پر اس کے چاروں تیمار دار بیٹھے تھے۔ وہ چاروں گفتگو میں مصروف تھے۔ موضوع گفتگو اسپتال کی گندگی اور غلاظت تھی۔ مریضوں کی حالت، رش، بدحواسی، دادا جان معروف تجزیہ کار سب کو اپنا مشاہدہ بتا رہے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ افسوس بھی کر رہے تھے کہ وہ اپنی ڈائری ساتھ لانا بھول گئے۔

ابا جان کے خیال میں اب مزید اس ملک میں رہنا اپنی نئی نسل سے دشمنی تھی۔ بچوں کی بہترین تربیت اور اچھے مستقبل کے لیے اس ملک کو جلد از جلد چھوڑنا ضروری ہو چکا تھا۔ یاسر اپنی آنکھیں بند کیے سب کی باتیں سن رہا تھا۔ اس شعر گنگنا کر گویا سب کو آئینہ دکھا دیا۔

طوفاں ہے اگر گھر کے در پے یوں بیٹھ نہ جاؤ کچھ تو کرو
کھڑکی کے شکستہ شیشے پہ کاغذ ہی لگاؤ، کچھ تو کرو

دادا جان نے شرمندہ ہو کر دادی جان کی طرف دیکھا۔ ''دیکھا، میں نہ کہتی تھی صرف ٹی وی چینل پر بیٹھ کر تجزیہ کرنے اور تنقید کرنے کی بجائے کچھ عملی کام کیا کریں۔'' دادی جان نے پوتے کے برجستہ شعر پر فخر سے کہا۔ وہ بولیں: ''دادو! اب اس قوم کے بچے یہ عملی کام کیا کریں گے۔ آپ فکر نہ کریں۔'' یاسر دادا جان کے ساتھ بیٹھتے ہوئے خوشی سے بولا۔ آج اسے خود بھی معلوم ہو گیا تھا کہ بے شمار لفظوں پر عمل کا ایک لمحہ ہمیشہ بھاری ہوتا ہے۔ ☆☆

مدیرِ تعلیم و تربیت! السلام علیکم! کیسے ہیں آپ؟

میں نے اس مہینے کا رسالہ پڑھا۔ اس رسالے میں جو عنوانات اور کہانیاں تھیں، وہ مجھے بہت پسند آئیں۔ تعلیم و تربیت میرے گھر اگست 2014ء سے آنا شروع ہوا کیوں کہ اس سے پہلے میں سعودی عرب میں ہوتی تھی اور جس مہینے میں یہاں پاکستان آئی، اسی مہینے میں نے اپنے امی ابو کو فرمائش کر کے لگوا لیا۔ میں اور میرے بہن بھائی اسے شوق سے پڑھتے ہیں۔ آپ نیا ناول کب شروع کر رہے ہیں؟ کہانیوں میں ابابیلوں کا سفر اور سالک بہت پسند آئیں۔ میں پہلی دفعہ خط لکھ رہی ہوں تو اُمید ہے کہ آپ میرا خط ضرور شائع کریں گے۔ (ہادیہ مسعود، حفصہ قریشی، راول پنڈی)

☆ ڈیئر! ناول جلد ہی شروع کریں گے۔ پسندیدگی کا شکریہ!

اُمید ہے آپ خیریت سے ہوں گی۔ اس ماہ کا رسالہ بہت اچھا تھا اور اسی وجہ سے میں لکھنے پر مجبور ہو گئی۔ ہمیشہ کی طرح ٹائٹل اس دفعہ بھی زبردست تھا۔ حمد اور نعت بھی اچھی تھی۔ درسِ قرآن و حدیث تو ہوتا ہی لاجواب ہے۔ اس کے علاوہ ابابیلوں کا سفر، محاورہ کہانی، صندوق کے پیسے اور کھڑ کھاند گروپ بہت ہی زبردست تھے اور سب سے بہترین انسائیکلوپیڈیا رہا۔ ماشاء اللہ آپ کا رسالہ اچھا جا رہا ہے مگر کاغذ اچھی کوالٹی کا استعمال کیا کریں۔ (عائشہ خان نیازی، بھکر)

پیاری ایڈیٹر صاحبہ، السلام علیکم! کیسی ہیں آپ؟ میں دوسری بار خط لکھ رہی ہوں۔ مارچ کا شمارہ زبردست تھا۔ تمام کہانیاں ٹاپ پر تھیں۔ قاضی کی ذہانت، آپ بھی لکھیے، صندوق کے پیسے اور زندہ مردہ بہترین کہانیاں تھیں۔ اللہ تعالیٰ تعلیم و تربیت کو دن دگنی اور رات چگنی ترقی دے۔ (آمین!) اگر آپ نے اس دفعہ بھی میرا خط شائع نہ کیا تو میں ناراض ہو جاؤں گی۔ (ربیعہ آفتاب، ایبٹ آباد)

السلام علیکم! اُمید ہے کہ آپ سب خیریت سے ہوں گے۔ میں نے پچھلی بار بھی خط لکھا تھا مگر شائع نہیں ہوا۔ ہمیشہ کی طرح فروری کا شمارہ بھی بہترین تھا۔ جواب اور کھڑ کھاند میوزیکل گروپ زبردست کہانیاں تھیں۔ میری چھوٹی بہن بھی تعلیم و تربیت بہت شوق سے پڑھتی ہے اور ایک دن میں سارا پڑھ کر ہی سانس لیتی ہے۔ تعلیم و تربیت بچپن سے ہی ہم سب بہن بھائیوں کا پسندیدہ رسالہ ہے۔ اللہ تعالیٰ تعلیم و تربیت کو دن دگنی اور رات چگنی ترقی دے۔ (آمین!)

(زنیرہ جاوید بٹ، گوجرانوالہ)

السلام علیکم! میں پہلی مرتبہ خط لکھ رہا ہوں لیکن میں تعلیم و تربیت تین سال سے پڑھ رہا ہوں۔ اس ماہ سرورق بہت ہی خوبصورت تھا۔ ابابیلوں کا سفر دل کو اچھا لگا۔ صبح کا بھولا، کھڑ کھاند گروپ ڈاٹ کام، صندوق کے پیسے، زندہ مردہ، قاضی کی ذہانت اور مالک بھی حیرت انگیز کہانیاں تھیں۔ آپ سے گزارش ہے کہ آپ میرا خط ضرور شائع کریں۔ میں آپ کا شکر گزار ہوں گا۔

(انوشہ افتخار، ذوہین افتخار، عبدالمعیز سومرو، لودھراں)

☆ آپ کی پسندیدگی کا بہت بہت شکریہ!

السلام علیکم! ایڈیٹر صاحبہ، کیسی ہیں آپ اور آپ مجھے یہ بتائیں آخر میرا قصور کیا ہے؟ آپ میرے خطوط کیوں نہیں شائع کرتیں؟ یہ میرا تیسرا خط ہے۔ اگر اب بھی آپ نے میرا خط شائع نہ کیا تو میرا دل ٹوٹ جائے گا اور میں رونے بیٹھ جاؤں گی۔ کچھ تحریریں بھی بھیجی ہیں، پلیز شائع کر لیجئے گا۔ کیا میں کہانی بھی بھیج سکتی ہوں؟ جواب ضرور دیں۔ سندباد جہازی اور صبح کا بھولا کہانی اچھی تھیں۔ (ماریہ عبدالناصر، کلورکوٹ)

السلام علیکم! کیا حال ہے؟ اُمید ہے کہ تعلیم و تربیت کی پوری ٹیم بخیریت ہو گی۔ میرا نام مشیرہ ہے اور میں پنجم جماعت کی طالبہ ہوں۔ مجھے تعلیم و تربیت پڑھنے کا بے حد شوق ہے۔ تعلیم و تربیت ہر لحاظ سے ایک بہترین رسالہ ہے۔ ہر مہینے تعلیم و تربیت کا شدت سے انتظار رہتا ہے۔ میں تقریباً ڈیڑھ سال سے تعلیم و تربیت پڑھ رہی ہوں لیکن خط پہلی بار بھیج رہی ہوں اور کچھ تحریریں بھی بھیج رہی ہوں۔ پلیز میڈم! میری تحریریں ضرور شائع کریں ورنہ میں ناراض ہو جاؤں گی۔ مجھے اُمید ہے کہ اب نہ صرف میری تحریروں کو اپنے پیارے رسالے میں جگہ دیں گے بلکہ میری حوصلہ افزائی بھی کریں گی تاکہ

میں آئندہ بھی لکھ سکوں۔ تعلیم و تربیت زندہ باد! (مشیرہ سلیمان بٹ)

☆ آپ کی تحریریں معیاری ہوئیں تو ضرور شائع ہوں گی۔

ڈیئر ایڈیٹر، السلام علیکم! اُمید ہے کہ آپ سب لوگ خیریت سے ہوں گے۔ تعلیم و تربیت پڑھنا میرا پسندیدہ مشغلہ ہے۔ میں تیسری جماعت سے تعلیم و تربیت پڑھ رہی ہوں۔ پچھلا شمارہ بہت شاندار رہا۔ ایک فرمائش ہے کہ جلدی سے ناول شروع کر دیں۔ میرے میٹرک کے امتحانات شروع ہونے والے ہیں اور مجھے دعاؤں کی بہت ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہوں کہ تعلیم و تربیت اسی طرح ترقی کی منزلیں طے کرتا رہے۔ (آمین!)

جس طرح بن کے آیا ہمارا ملک ستارا

اسی طرح بن جائے تعلیم و تربیت تارا

آپ نے جو ریسیپی کا سلسلہ شروع کیا ہے، وہ بہت اچھا ہے۔ میں نے آج زنگر برگر بنایا ہے اور اپنی دوستوں کو بھی کھلایا تو سب کو بہت اچھا لگا اور میری تعریف بھی ہوئی۔ یہ آپ کے اس سلسلے کی بدولت ہے۔ اس کو جاری رکھیے گا، یہ بہت اچھا ہے۔ (رومیثہ، لاہور)

☆ ڈیئر! آپ کے لیے ڈھیروں دُعائیں۔

السلام علیکم! مارچ کا مہینہ تو ویسے ہی فائنل امتحان کا ماہ ہوتا ہے۔ ہر کوئی پڑھنے میں ہی لگا ہوتا ہے لیکن جہاں تک بات تعلیم و تربیت کی ہے تو چمن تعلیم و تربیت پُر بہار زوروں پر تھی اور بہار کی رنگینیاں سب کی توجہ کا مرکز تھی۔ تمام چیزیں دلچسپ تھیں۔ تعلیم و تربیت کا ہار موتیوں سے پُر تھا۔ تعلیم و تربیت وہ ہیرا ہے جس کی چمک دمک سے طالب علموں کے دماغ روشن ہو رہے ہیں۔ یہ ہمارے استاد کی طرح ہے کیوں کہ ایک لفظ بھی سکھا دینے والا بھی استاد کہلاتا ہے اور کتاب تو انسان کی بہترین دوست ہوتی ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ تعلیم و تربیت نامی دوست سے میری فروری 2013ء میں ملاقات ہوئی اور ان شاء اللہ دوستی تا قیامت قائم رہے گی۔ ہر کوئی خوش حال رہے، آباد رہے! آپ پر سلامتی ہو۔ (اسامہ ظفر راجہ، سرائے عالم گیر)

☆ ڈیئر اسامہ اتنا خوب صورت خط لکھنے کا شکریہ۔

ہر ایک ذرہ فضا کا داستاں اس کی سناتا ہے

ہر ایک جھونکا ہوا کا آ کر دیتا ہے پیغام اس کا

السلام علیکم! اس مہینے کا تعلیم و تربیت پڑھ کر یہ شعر یاد آ گیا۔ سچ میں زبردست تھا۔ بڑا لطف ملا۔ رسالے میں تمام کہانیاں زبردست تھیں۔ سندباد کا سفر اور کھڑکھاند گروپ بہت اچھے اور لطف اندوز سلسلے ہیں۔ ہو سکے تو یہ سلسلہ جاری رکھیے گا۔ اچھا! اب اجازت چاہیے۔ تعلیم و تربیت، زندہ باد! (ماہ نور منزہ، بہاول پور)

تعلیم و تربیت میں دونوں ہی چیزیں موجود ہیں یعنی تعلیم بھی اور تربیت بھی۔ میرے پاپا بھی بچپن میں اسے پڑھتے رہے ہیں۔ پاکستان کے شہروں کے تعارف کا سلسلہ شروع کریں۔ عبدالستار ایدھی کا انٹرویو شائع کریں۔ خدمتِ خلق کرنے والوں کا تعارف ضرور ہونا چاہیے۔ (زینب عظیم صدیقی، لاہور)

☆ آپ کی فرمائش ضروری پوری کریں گے۔

السلام علیکم! اُمید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ میں ایک سال سے تعلیم و تربیت باقاعدگی سے پڑھ رہا ہوں۔ یہ ایک بہت اچھا اور معلوماتی رسالہ ہے۔ کہانیاں سب ہی سپرہٹ ہیں۔ معلومات عامہ اور بچوں کا انسائیکلو پیڈیا بہت زبردست ہیں۔ یہ میرا پہلا خط ہے۔ اُمید ہے شائع کر کے میری حوصلہ افزائی کریں گے۔ خدا حافظ! (محمد عمیس خان، نوال خان، ڈیرہ غازی خان)

میں آپ کا رسالہ پچھلے 10 ماہ سے پڑھ رہی ہوں۔ یہ نہایت اچھا رسالہ ہے۔ مجھے بے حد پسند آیا ہے۔ یہ میرا پہلا خط ہے۔ اس بار رسالے میں سندباد کا سفر، میری بیاض سے اور محاورہ کہانی بہت پسند آئیں۔ اللہ تعالیٰ تعلیم و تربیت کو ترقی عطا فرمائے۔ آمین! (فزا انیس، لاہور)

ان ساتھیوں کے خطوط بھی بڑے مثبت اور اچھے تھے، تاہم جگہ کی کمی کے باعث ان کے نام شائع کیے جا رہے ہیں:

لیلیٰ جلیل الرحمٰن یوسف زئی، نوشہرہ۔ نوریہ مدثر، سیال کوٹ۔ صبغہ قمر، حمنہ قمر، فیصل آباد۔ محمد احمد خان غوری، بہاول پور۔ نمرہ عبدالخالق، افراح اکبر، محمد شاہد جمعہ، مریم اعجاز، مریم ہاشم، لاہور۔ محمد عرفان نواز، ڈیرہ غازی خان۔ عائشہ مریم شاہ، پشاور۔ بینش اشرف، وزیر آباد۔ محمد ریان احمد، اسلام آباد۔ سید محمد موسیٰ، کراچی۔ طیبہ طاہر، جھنگ صدر۔ اُشنہ ندیم، عبدالکریم، گوجرانوالہ۔ سدرہ مسعود، عمیر علی، راول پنڈی۔ عائشہ شہباز، وہاڑی۔ ثانیہ طلعت، سیال کوٹ۔ زیب النساء، گجرات۔ اکرم ایاز، ڈیرہ غازی خان۔ سعد رفیق، راول پنڈی۔ انیتا سلیمان، پشاور۔ روزینہ اکبر، خیبر ایجنسی۔ صبا نور، جہلم۔ آفاق انور، کراچی۔ سائرہ مشتاق، اوکاڑہ۔ منیب اسلم، گوجرانوالہ۔ فرح بشیر، گوجرانوالہ کینٹ۔ نعمان اکمل، خانیوال۔ ثمرہ مشتاق، حیدر آباد۔ محمد عثمان غنی، ڈیرہ غازی خان۔ بشیر اسلم، سیال کوٹ۔ عروبہ سعید، پنڈی بھٹیاں۔ امجد اسلام، اوکاڑہ۔ جویریہ اسلم، راول پنڈی۔

تین شہزادے ایک شہزادی

کسی بادشاہ کی ایک لڑکی تھی۔ جتنی خوب صورت، اتنی ہی عقل مند۔ جب وہ جوان ہوئی تو اڑوس پڑوس کے ملکوں سے رشتے آنے لگے۔ ہر شہزادہ چاہتا تھا کہ وہ شہزادی سے شادی کرے لیکن شہزادی نے صرف تین شہزادے پسند کیے۔ ان میں سے ایک شہزاد فہد تھا۔ اس کی سلطنت بہت لمبی چوڑی تھی، خزانے سونے چاندی سے بھرے ہوئے تھے اور ایک بہت بڑی فوج بھی تھی جو بڑے سے بڑے دشمن کے دانت کھٹے کر سکتی تھی۔ دوسرے شہزادے کا نام محمود تھا۔ اس کا ملک بھی شہزادہ فہد کے ملک جیسا ہی مال دار اور طاقت ور تھا لیکن یہ دونوں شہزادے شکل صورت کے معاملے میں شہزادی کے جوڑ کے نہ تھے اور پھر انہوں نے ٹافیاں، ببل گم اور چوئنگم کھا کھا کر اپنے دانتوں کا ستیاناس کر لیا تھا۔ ہنستے تو پیلے پیلے دانت بہت بدنما معلوم ہوتے۔

تیسرا شہزادہ محسن، لمبا تڑنگا، چھریرے بدن کا، سمارٹ نوجوان تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ قدرت نے اسے فرصت کے وقت، آرام سے بنایا ہے اور اس کے بھیجے میں عقل بھی ٹھونس ٹھونس کر بھری ہے، لیکن بدقسمتی سے محسن کا ملک بہت چھوٹا اور بہت غریب تھا۔ اس کے پاس اتنی دولت نہ تھی کہ وہ شہزادی کی ہر خواہش پوری کر سکے۔ بادشاہ، ملکہ، وزیراعظم غرض تمام لوگ یہی سمجھتے تھے کہ شہزادی فہد اور محمود میں سے کسی کو پسند کرے گی لیکن جب شہزادی نے اپنا فیصلہ سنایا تو بادشاہ اور اس کے وزیر امیر سب حیران رہ گئے۔ شہزادی نے کہا: ''ہم شہزادہ محسن سے شادی کریں گے۔''

بادشاہ سر کھجا کر بولا: ''مابدولت کی رائے میں آپ کا یہ فیصلہ نہایت واہیات قسم کا ہے۔ اس بے وقوف کے پاس، سوائے شکل کے، اور دھرا کیا ہے؟''

فوج کا کمانڈر انچیف کہنے لگا: ''میں نہایت ادب سے عرض کروں گا کہ شہزادی صاحبہ اپنے فیصلے پر غور فرمائیں۔ فوج ہرگز یہ برداشت نہ کرے گی کہ اس کی شہزادی ایک پھٹیچر آدمی سے بیاہ کرے۔''

وزیراعظم ہاتھ باندھ کر بولا: ''فوج میں بے چینی پھیل گئی تو وہ ملک میں مارشل لا لگا دے گی اور حضور بادشاہ سلامت کو تخت و تاج سے ہاتھ دھونا پڑیں گے۔''

وزیر داخلہ نے کہا: ''حضور شہزادی صاحبہ، اس کی شکل پر نہ جائیں۔ اس سے اچھے اچھے، خوب صورت نوجوان سائیکلوں میں ہوا بھر رہے ہیں۔''

خوب صورت اور عقل مند شہزادی سوچ کر بولی: ''اچھا، تو پھر ایک صورت ہے۔ ہم تینوں شہزادوں کا امتحان لیں گے۔ جو شہزادہ امتحان میں پورا اترے گا، اسی سے شادی کریں گے۔ لو سنو! ہمارا حکم ہے کہ تینوں شہزادے، گھوڑوں پر سوار ہو کر، الگ الگ سمتوں میں جائیں۔ ایک سال دُنیا کی سیر کریں۔ گاؤں گاؤں، شہر شہر گھومیں، نئی نئی جگہیں دیکھیں۔ نت نئے لوگوں سے ملیں اور پھر ہمارے لیے ایسے عجیب اور نایاب تحفے لائیں جن کا دُنیا میں جواب نہ ہو۔ جس شہزادے کا تحفہ سب سے اچھا اور انوکھا ہو گا، وہی ہمارا شوہر بننے کا حق دار ہوگا۔''

دوسرے دن تینوں شہزادے گھوڑوں پر سوار ہوئے اور اللہ کا نام لے کر، سفر پر روانہ ہو گئے۔ شہر کے باہر ایک لمبا چوڑا ریگستان تھا۔ وہ کئی دن اس ریگستان کی ریت پھانکتے رہے اور آخر ایک روز کھجوروں کے ایک ہرے بھرے نخلستان میں پہنچے۔ یہاں سے تین راستے تین مختلف سمتوں میں جاتے تھے۔

شہزادہ فہد خوش ہو کر بولا: ''اللہ کا شکر ہے کہ اس نے ہماری راہ نمائی فرمائی۔ اب وقت آ گیا ہے کہ ہم جدا ہو کر الگ الگ راستوں پر جائیں، اور اپنی اپنی قسمت آزمائیں۔''

وہ رات انہوں نے نخلستان ہی میں بسر کی۔ صبح اٹھ کر وضو کیا، نماز پڑھی، ناشتا کیا اور گھوڑوں پر سوار ہوئے۔ فہد بولا: ''اچھا، خدا حافظ! زندگی رہی تو ان شاء اللہ، پھر ملیں گے۔''

''ان شاء اللہ، ان شاء اللہ!'' محمود اور محسن نے ایک زبان ہو کر کہا۔

شہزادہ فہد نے گھوڑے کی لگام دائیں طرف موڑ دی۔ شہزادہ محمود نے بائیں جانب اور شہزادہ محسن ناک کی سیدھ پر چلنے لگا۔

ٹھیک ایک سال بعد تینوں شہزادے اسی نخلستان میں واپس آئے اور ایک دوسرے کو زندہ سلامت دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ شہزادہ فہد نے شہزادہ محمود سے پوچھا: ''بھئی، آپ کیا عجیب چیز لائے ہیں؟ ذرا ہمیں بھی تو دکھائیے۔''

محمود بولا: ''میں چلتے چلتے ایک بہت اونچے پہاڑ کے پاس پہنچا، جو یہاں سے پانچ سو میل کے فاصلے پر ہے۔ اس پہاڑ کے دامن میں ایک غار ہے، جس میں ایک جن رہتا ہے۔ جب وہ جن غار سے نکل کر باہر چلا گیا تو میں اندر گھس گیا۔ وہاں مجھے یہ عجیب و غریب چیز ملی۔'' یہ کہہ کر اس نے، تھیلے میں سے شیشے کا ایک گولا نکالا۔

''ایں! یہ تو شیشے کا ایک معمولی گولا ہے۔ بازار میں ٹکے ٹکے بکتا ہے۔ یہ کون سی ایسی انوکھی چیز ہے!'' شہزادہ فہد منہ بنا کر بولا۔

''یہ معمولی چیز نہیں ہے، میرے بھائی!'' محمود نے کہا۔ ''یہ جادو کا گولا ہے۔ آپ دُنیا کے جس شہر، قصبے، گاؤں، دریا، پہاڑ، مکان، کھیت، کھلیان، آدمی یا چرند پرند کو دیکھنا چاہیں گے، وہ اس گولے میں آپ کو نظر آ جائے گا۔''

فہد اور محسن بولے: ''تب تو بھئی یہ واقعی انوکھی چیز ہے۔''

اب محمود نے فہد سے پوچھا: ''اب آپ اپنی سنائیے۔ آپ کہاں گئے اور وہاں سے کیا لائے؟''

فہد نے کہا: ''میں منہ اُٹھائے، گھوڑے کو بگ ٹٹ دوڑائے چلا جا رہا تھا کہ ایک ویران، سنسان، لق و دق بیابان نظر پڑا۔ اس ویرانے میں پُرانے وقتوں کے کسی بادشاہ کا ٹوٹا پھوٹا مقبرہ تھا۔ میں تھوڑی دیر دم لینے کو اندر گیا تو وہاں یہ عجیب چیز ملی۔''

یہ کہہ کر اس نے اپنے گھوڑے کی کاٹھی سے ایک گٹھڑی کھولی اور اس میں سے ایک قالین نکال کر فرش پر بچھا دیا۔

شہزادہ محمود قالین دیکھ کر بولا: ''بھائی جان، اس قالین میں کون سی ایسی انوکھی بات ہے؟ اس سے اچھے اور خوب صورت قالین تو ہمارے ہاں مال روڈ پر پٹھان بیچتے پھرتے ہیں۔''

''اس میں کوئی انوکھی بات ہے، تب ہی تو میں لایا ہوں۔'' فہد مسکرا کر بولا: ''یہ اُڑن قالین ہے، میرے بھائی۔ بس آپ اس پر بیٹھ جائیے۔ جہاں جانا چاہیں گے، پلک جھپکتے میں یہ آپ کو وہاں پہنچا دے گا۔''

''سبحان اللہ، سبحان اللہ! واقعی یہ انوکھی چیز ہے۔'' محمود اور محسن حیران ہو کر بولے۔

فہد اور محمود اپنے اپنے تحفے دکھا چکے تھے۔ اب محسن کی باری تھی۔ دونوں شہزادوں نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا اور پوچھا: ''اب آپ فرمائیے، آپ کیا لائے ہیں؟''

''میں جو چیز لایا ہوں، وہ سچ مچ بہت عجیب اور انوکھی ہے۔''

محسن نے کہا۔ ''ذرا ہم بھی تو دیکھیں۔ کہیں آسمان کے تارے تو نہیں توڑ لائے؟'' شہزادہ فہد ہنس کر بولا۔

''یہ چیز آسمان کے تاروں سے بھی زیادہ قیمتی ہے۔'' محسن نے کہا اور جیب میں سے ایک سنگترہ نکال کر ان کے سامنے رکھ دیا۔ پھر بولا۔ ''میں سفر کرتے کرتے شہر فسطاط جا پہنچا۔ وہاں مجھے ایک فقیر ملا۔ اس نے مجھے سونے کی تین اشرفیوں کے بدلے یہ سنگترہ دے دیا۔''

فہد قہقہہ لگا کر بولا: ''معلوم ہوتا ہے، لمبے سفر نے تمہارے دماغ کی چولیں ڈھیلی کر دی ہیں۔ ارے میاں بدھو! ایسے سنگترے تو ہمارے ہاں چار روپے درجن عام ملتے ہیں۔''

''ذرا دھیرج سے کام لیجیے۔'' محسن نے کہا۔ ''یہ وہ سنگترہ نہیں ہے۔ یہ مردے کو زندہ کر دیتا ہے۔ کوئی شخص کتنا ہی بیمار ہو، آخری سانس لے رہا ہو، موت کا فرشتہ سر پر منڈلا رہا ہو، اس سنگترے کا رس اس کے حلق میں ٹپکا دو۔ ایک دم بھلا چنگا ہو جائے گا۔''

''پھر تو بھئی، یہ واقعی عجیب چیز ہے۔'' شہزادہ محمود اور شہزادہ فہد نے کہا اور پھر تینوں دسترخوان بچھا کر کھانا کھانے لگے۔

کھانے کے بعد انہوں نے شکر الحمدللہ کہا، ہاتھ دھوئے، کلی کی اور جانے کی تیاری کر رہے تھے کہ فہد بولا: ''ایک سال سے ہمیں شہزادی کی خبر نہیں ملی۔ میرا خیال ہے، ٹھیک ٹھاک ہی ہو گی۔''

محمود نے کہا: ''کیوں نہ شیشے کے گولے میں دیکھ لیں؟'' اس نے گولا نکالا اور بولا: ''ہم بادشاہ کا محل دیکھنا چاہتے ہیں۔'' کہنے کی دیر تھی کہ گولے کے اندر شاہی محل دکھائی دینے لگا۔ محمود نے کہا: ''ہم شہزادی کو دیکھنا چاہتے ہیں۔'' ایک دم گولے میں شہزادی کا کمرا آ گیا لیکن شہزادی کو دیکھ کر تینوں شہزادے گھبرا کر اُچھل پڑے۔ شہزادی بستر پر آنکھیں بند کیے لیٹی تھی۔ اس کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد تھا۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑے ہوئے تھے۔ ارد گرد بادشاہ، ملکہ، وزیراعظم اور ڈاکٹر کھڑے تھے۔ سب زار و قطار رو رہے تھے۔ اچانک ڈاکٹروں نے مایوسی سے سر ہلایا۔ گویا شہزادی کے بچنے کی کوئی امید نہیں، وہ مر رہی تھی۔

''میرا سنگترہ شہزادی کی جان بچا سکتا ہے۔'' محسن نے چیخ کر کہا۔ ''لیکن ہم اتنی جلدی محل میں کیسے پہنچ سکتے ہیں؟ وہاں پہنچنے میں کم از کم تین دن لگیں گے۔''

''میرا قالین تمہیں منٹوں میں وہاں لے جائے گا۔'' شہزادہ فہد بولا۔ تینوں شہزادے قالین پر بیٹھ گئے اور قالین نے بجلی کی سی تیزی سے انھیں محل میں پہنچا دیا۔ وہ ٹھیک وقت پر پہنچے تھے۔ شہزادی دو ہچکیاں لے چکی تھی اور آخری ہچکی لینے والی تھی۔ شہزادہ محسن نے جلدی سے سنگترے کے چار ٹکڑے کیے اور ایک ٹکڑے کا رس شہزادی کے حلق میں ٹپکا دیا۔ ایک دم شہزادی کے چہرے پر رونق آ گئی۔ اس کے گال گلابی ہو گئے۔ محمود نے دوسرے ٹکڑے کا رس اس کے منہ میں ڈالا تو اس کی شربتی آنکھیں کھل گئیں۔ تیسرے ٹکڑے کا رس حلق میں ٹپکنا تھا کہ وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی اور جب محمود نے چوتھے ٹکڑے کا رس اس کے حلق میں ٹپکایا تو وہ بستر سے

اُٹھ کر اِدھر اُدھر دوڑنے لگی۔ بادشاہ اور ملکہ نے بڑی مشکل سے اسے پکڑ کر بستر پر بٹھایا۔

جب شہزادی کے ہوش ٹھکانے ہوئے تو وہ بولی: ''میں اس شہزادے سے شادی کروں گی، جس نے میری جان بچائی ہے۔''

ایک ڈاکٹر نے کہا: ''شہزادی صاحبہ کا اشارہ غالباً شہزادہ محسن کی طرف ہے۔ انہی کے سنگترے نے انہیں دوبارہ زندگی عطا کی ہے۔'' ''یہ سچ ہے۔'' وزیراعظم بولا۔ ''لیکن سنگترہ عین وقت پر یہاں کون لایا؟ یقیناً وہ شہزادہ فہد کا قالین ہے۔ میرا خیال ہے کہ شہزادی صاحبہ کا اشارہ شہزادہ فہد کی طرف ہے۔''

بادشاہ نے سر کھجایا اور پھر بولا: ''لیکن آپ لوگ یہ نہ بھولیں کہ اگر شہزادہ محمود کے پاس شیشے کا گولا نہ ہوتا تو شہزادہ فہد کا قالین اور محسن کا سنگترہ دونوں بے کار ثابت ہوتے۔ اس گولے ہی نے انہیں شہزادی کا حال بتایا۔ میرے خیال میں شہزادہ محمود ہی شہزادی کا شوہر بننے کا حق دار ہے۔''

اب جھگڑا شروع ہو گیا۔ طرح طرح کے منہ، طرح طرح کی باتیں۔ کوئی کچھ کہتا، کوئی کچھ۔ جب یہ جھگڑا کسی طرح ختم ہونے میں نہ آیا تو بادشاہ، ملکہ، وزیراعظم اور ڈاکٹروں نے وہی کیا جو انہیں پہلے کرنا چاہیے تھا۔ انہوں نے شہزادی سے پوچھا: ''آپ کا اشارہ کس شہزادے کی طرف ہے؟ آپ کے خیال میں ان تینوں میں کس نے آپ کی جان بچائی ہے؟''

شہزادی بولی: ''اس بارے میں کچھ کہنا بہت مشکل ہے۔ کوئی شہزادہ، دوسرے شہزادوں کی مدد کے بغیر میری جان نہ بچا سکتا تھا۔ اس کام میں ان تینوں کا برابر کا حصہ ہے اور میں تینوں کی شکرگزار ہوں۔''

وزیراعظم جلدی سے بولا: ''لیکن حضور، آپ ان تینوں سے تو شادی کر نہیں سکتیں۔''

''نہیں، شادی تو میں ایک ہی سے کروں گی۔ اور وہ ہے شہزادہ محسن۔''

''شہزادہ محسن!'' بادشاہ نے حیرت سے کہا۔ ''شہزادہ فہد یا شہزادہ محمود کیوں نہیں؟''

خوب صورت اور عقل مند شہزادی بولی: ''ابا حضور، شہزادہ محمود کے پاس شیشے کا گولا موجود ہے۔ وہ جب چاہے، اسے کام میں لا سکتا ہے۔ شہزادہ فہد کے پاس بھی اس کا قالین موجود ہے اور وہ بھی اس سے جب چاہے کام لے سکتا ہے۔ ان چیزوں کی مدد سے انہیں دُنیا کی حسین سے حسین شہزادیاں مل سکتی ہیں لیکن شہزادہ محسن کے پاس کیا ہے؟ ایک سنگترہ تھا اور وہ اس نے میرے اوپر قربان کر دیا۔''

بادشاہ ملکہ کی طرف دیکھ کر مسکرایا، ملکہ وزیراعظم کی طرف دیکھ کر مسکرائی، وزیراعظم ڈاکٹروں کی طرف دیکھ کر مسکرایا، اور پھر سب ایک ساتھ بولے: ''مبارک! مبارک! سلامت! سلامت!'' اور اس کے ساتھ ہی محل میں خوشی کے شادیانے بجنے لگے۔

☆☆☆

زبان کا سفر

چق: ترکی زبان کا یہ لفظ اب سے چند عشرے قبل برصغیر میں بہت معروف اور مقبول تھا، کیوں کہ گھر ہو یا دفتر، دروازے پر بانس یا سرکنڈے کی تیلیوں کا پردہ لٹکا رہتا تھا۔ اسے چلمن بھی کہتے ہیں۔ بہرحال ترکی زبان کا یہ چق انگریزی میں پہنچ کر چک ہو گیا اور انگریزوں نے اسے Chick کے ہجے کے ساتھ اپنی زبان میں شامل کر لیا بلکہ اپنی لغت میں درج کر لیا۔ معنی وہی ہیں: بانس کی تیلیوں سے بنا پردہ جو دروازے پر لٹکایا جاتا ہے۔

حاجز: یعنی رکاوٹ، عربی زبان کا لفظ ہے۔ یہ لفظ جب انگریزی زبان میں پہنچا تو وہاں اسے ہیج (Hedge) بنا لیا گیا، یعنی باڑھ جو رکاوٹ پیدا کرتی ہے۔

میزاب: ''پرنالے'' کو کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ عربی زبان کا لفظ ہے اور ''ازب'' سے مقدار کے وزن پر ''میزاب'' بن گیا لیکن فارسی دانوں نے اس لفظ کو فارسی ہی قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک یہ لفظ اصل میں تھا: ''آمیز آب'' یعنی: پانی شامل کرو، پانی گراؤ یا زیادہ جگہ جہاں سے پانی گر کر دوسرے پانی میں شامل ہو جائے۔ پھر یہ لفظ مختصر ہو کر ''میزاب'' بن گیا۔ دونوں دعوے درست معلوم ہوتے ہیں۔

گرداب: پانی کا چکر، منجدھار بھنور۔ یہ فارسی زبان کا لفظ ہے۔ ''گرد'' کے معنی ہیں: آس پاس اس سے ایک ترکیب بنی: ''گرد ہونا'' یعنی پیچھے پڑنا۔ ''گرداگرد'' کے معنی ہیں: چاروں طرف گویا ''گرد آب'' سے مراد لیا جائے گا: چاروں طرف پانی۔ یہی گرداب ہے۔

ایک بوڑھا بادشاہ اپنی رعایا کی خوش حالی کے لیے دن رات کام کرتا تھا اور چاہتا تھا کہ اس کے مرنے کے بعد بھی رعایا اتنی ہی خوش اور محفوظ رہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے اولاد جیسی نعمت سے نہ نوازا تھا۔ بادشاہ نے کافی سوچ بچار اور جدوجہد کر کے پانچ نیک دل اور پرہیزگار نوجوانوں کو اپنا ولی عہد مقرر کرنے کے لیے منتخب کیا۔ اب ان کی ذہانت آزمانے کی باری تھی تاکہ امورِ مملکت تسلی بخش انداز میں چلایا جا سکے۔

بادشاہ بچوں اور امیدواروں کو 100 روپے دیتا ہے اور کہتا ہے کہ 100 روپے میں تین قسم کے پرندے آنے چاہئیں اور ان کی تعداد بھی 100 ہو یعنی 100 روپے میں 100 پرندے۔

بازار میں چڑیاں ایک روپے میں 20 کی تعداد میں ملتی ہیں، کبوتر ایک روپے کا اور ایک تیتر 5 روپے میں ایک ملتا ہے۔

پیارے بچو! آپ بادشاہ سلامت کے حکم کے مطابق 100 روپے میں 100 پرندے اکٹھے کریں اور اپنے آپ کو حکمران بننے کا اہل ثابت کریں۔

مارچ 2015ء میں شائع ہونے والے ''کھوج لگائیے'' کا صحیح جواب یہ ہے:

15 روپے میں 22 چاکلیٹ آئیں گے۔
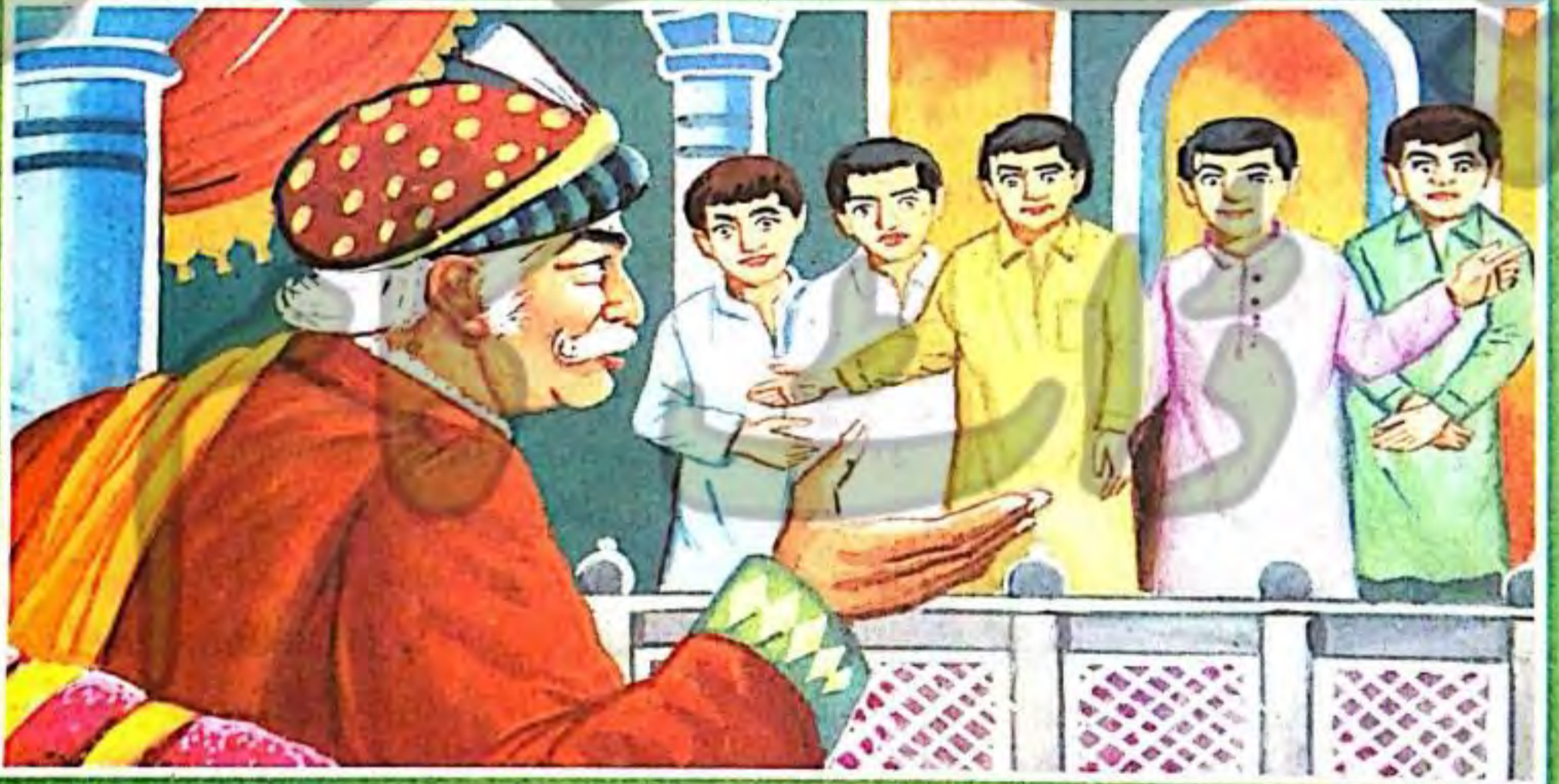
مارچ 2015ء کے کھوج لگائیے میں قرعہ اندازی کے ذریعے درج ذیل بچے انعام کے حق دار قرار پائے ہیں:

1- محسن علی، حسن ابدال
2- عائشہ مجید، لاہور
3- السیدہ طیبہ شباہت، پشاور
4- محمد حکمت یار، بنوں
5- عمر احسن، لاہور

مالدیپ بحرِ ہند میں تقریباً 1200 چھوٹے چھوٹے جزیروں پر مشتمل ایک مجمع الجزائر ہے۔ یہ سری لنکا سے 400 میل جنوب مغرب میں واقع ہے۔ مالدیپ کا سرکاری نام جمہوریہ مالدیپ ہے۔ اس کا رقبہ 115 مربع میل یعنی 298 مربع کلومیٹر ہے۔ آبادی کی غالب اکثریت بھارتی سنہالی اور عرب آباد کاروں پر مشتمل ہے۔ اس کی زبان دیویہی (Divehi) ہے اور مذہب اسلام ہے۔ مسلمان اکثریت میں ہیں۔ سکہ مالدیپی روپیہ کہلاتا ہے۔

مالدیپ کا دارالحکومت مالے (Male) ہے۔ اس کا رقبہ 2 مربع کلومیٹر اور آبادی 8500 نفوس پر مشتمل ہے۔ یہ ملک کی کل آبادی کا ایک چوتھائی حصہ ہے۔ یہ بھی ایک جزیرہ ہے جو مشرق کی طرف تقریباً ڈیڑھ کلومیٹر لمبا ہے۔ یہ زندگی سے بھرپور ایک شہر ہے اور نہ صرف دارالحکومت ہے بلکہ ملک کی تمام اہم سرگرمیوں کا مرکز بھی یہی شہر ہے۔ مالے میں خوب صورت مساجد بھی ہیں۔ مالدیپ کی سب سے بڑی مسجد مالے میں ہے جو صدارتی محل سے چند قدم کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ جامع مسجد 1656ء میں تعمیر کی گئی تھی۔ اس مسجد میں لکڑی پر نقاشی کے انتہائی خوب صورت نمونے نظر آتے ہیں۔ نقاشی کے یہ خوب صورت نمونے اس دور کی یاد دلاتی ہیں، جب مالدیپ اسلام کی روشنی سے منور ہوا تھا۔ ملک کی سب سے بڑی بندرگاہ اور بین الاقوامی ایئرپورٹ بھی مالے میں ہے۔ اس کا ایئرپورٹ دُنیا میں اپنی نوعیت کا واحد ایئرپورٹ ہے۔ یہ جس جزیرے پر واقع ہے اس کا نام ہولولے ہے۔

مالدیپ کی آب وہوا گرم مرطوب ہے، اس لیے یہاں گرم مرطوب خطوں کے تمام پودے اور جانور جیسے کبوتر، کوّے، بطخ، سانپ، چمگادڑ، کچھوے اور بلیاں وغیرہ پائے جاتے ہیں۔

مالدیپ میں کوئی معدنی دولت نہیں ہے بلکہ آمدنی کا بیشتر حصہ ماہی گیری، سیاحت اور گھونگھوں سے حاصل ہوتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی گھریلو صنعتیں قائم ہیں، جن میں ناریل کے ریشے سے مختلف چیزیں تیار کی جاتی ہیں۔

جزائر مالدیپ ایک زیرِ آب آتش فشاں سلسلہ کوہ پر واقع ہیں اور ان میں سے بیشتر ناریل کے درختوں سے ڈھکے ہوئے ہیں۔ آبادی کی اکثریت کا پیشہ ماہی گیری ہے۔ فاضل مچھلی برآمد کی جاتی ہے ملک میں صدارتی نظام رائج ہے۔ پارلیمنٹ (مجلس) ایک

ایوانی ہے اور اس کے 48 ارکان ہیں۔ ان میں سے 8 کو صدر نامزد کرتا ہے اور 40 کو عوام پانچ سال کے لیے منتخب کرتے ہیں۔ جزیروں پر حکومت کے مقرر کردہ ناظم حکومت کرتے ہیں۔

جزائر مالدیپ کو چودھویں صدی عیسوی میں ابن بطوطہ نے دریافت کیا۔ 1953ء تک یہ ویدی خاندان کے سلطانوں کے زیرِنگین رہے لیکن یہ سلطان صرف اندرونی معاملات میں خودمختار تھے۔ 1518ء میں ان جزائر پر پُرتگال نے قبضہ کر لیا اور سلطان پُرتگالیوں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنے رہے۔ سترہویں صدی میں ولندیزیوں نے (جو سری لنکا پر قابض تھے) پُرتگالیوں کو ان جزائر سے بے دخل کر دیا۔ بعدازاں ہالینڈ (ولندیز) فرانسیسی انقلابی افواج کے زیرِنگیں آ گیا تو انگریزوں نے موقع سے فائدہ اُٹھا کر ولندیزوں کو سری لنکا سے نکال باہر کیا اور جزائر مالدیپ خود بخود 1887ء میں ان کی جھولی میں آن گرے۔ انگریزوں نے بھی سلاطین کی اندرونی خودمختاری بحال رکھی۔ 1965ء میں 26 جولائی جمہوریہ مالدیپ نے مکمل آزادی حاصل کی۔ 1968ء میں سلطنت کا خاتمہ کر کے صدارتی نظام نافذ کیا گیا اور ابراہیم ناصر منتخب ہوئے۔

1978ء میں مامون عبدالقیوم ملک کے صدر منتخب ہوئے۔ 1983ء اور 1988ء میں انہیں پھر ملک کا صدر منتخب کر لیا لیکن 1988ء میں ملک میں بے چینی کی فضا پائی گئی اور عوامی مظاہرے بھی ہوئے۔ 4 نومبر 1988ء کو صدر مامون عبدالقیوم کی حکومت کا تختہ الٹنے کی کوشش کی گئی جسے بھارتی فوجی دستوں نے ناکام بنا دیا اور شرپسند گرفتار کر لیے گئے۔ فروری 1990ء میں صدر مامون عبدالقیوم نے ملک میں قانون ساز اداروں کے قیام کا اعلان کیا۔ صدر نے قانون ساز اداروں میں عوامی شرکت کو مؤثر بنانے کے لیے شوریٰ کونسل کے ارکان کی تعداد بڑھا کر 15 سے 55 کر دی۔ جولائی 1990ء میں صدر قیوم نے سابق جلاوطن صدر ابراہیم ناصر کو معافی دینے کا اعلان کیا۔ 21 نومبر 1990ء کو مالدیپ کے دارالحکومت مالے میں سارک ممالک کے سربراہوں کی کانفرنس منعقد ہوئی۔ 2 جولائی 1991ء کو دارالحکومت مالے میں سارک وزراء خارجہ کی کانفرنس کا انعقاد عمل میں آیا۔☆☆☆

فنِ تقریر

کسی بڑے، قدِ آدم آئینے کے سامنے کھڑے ہوں۔ آئینے پر نگاہ ڈالیں۔ اپنے آپ کو اپنے تاثرات کو دیکھتے ہوئے، جو تقریر آپ کو کرنی ہے، اس کی مشق کریں۔ ہر جملہ اس طرح بولیں کہ ایک ایک لفظ کے درمیان ہلکا وقفہ دیں۔ چہرے کے تاثرات کو ساتھ ساتھ دیکھتے جائیں۔ منہ سے نکلنے والے الفاظ کے تاثرات کو اپنے سامعین تک پہنچانے کے لیے مشق کریں۔ یہ جملہ بولیں:

میں یہ منظر دیکھ کر حیران (ہلکا وقفہ) پریشان (ہلکا وقفہ) اور دم بخود (ہلکا وقفہ) رہ گیا۔

یہ جملہ بولتے ہوئے آئینے کی طرف دیکھیں۔ نوٹ کیجیے کہ کیا آپ کے ہاتھوں میں حرکت پیدا ہوئی اور جو الفاظ آپ کی زبان سے نکلے، ان کا تاثر آپ کے چہرے پر ظاہر ہوا؟ ایک پریشان، حیران اور دم بخود چہرے کا عکس آئینے میں دکھائی دیا؟

ایک بار پھر مشق کریں۔ اپنی خامیوں کو آئینے میں دیکھ کر دُور کریں۔ جب آپ بول رہے ہوں تو آپ کے ہاتھ فطری انداز میں ہلنے چاہئیں۔ آپ کا منہ کھلا ہو اور آپ کا چہرہ تاثرات کا بھرپور انداز میں اظہار کرے۔

آئینے کے سامنے مشق کرنے سے آپ اپنے حجاب، اپنی خامیوں اور کوتاہیوں پر قابو حاصل کر سکتے ہیں۔

تقریر کے دوران میں مناسب اور مختلف مواقع پر حقائق کا اظہار کریں، ایسے حقائق جو ہر شخص قبول کرتا ہے، جس میں کسی سامع کو کسی طرح کا شک نہیں ہوتا۔ ایسی سچائیاں اور حقائق سامعین کو آسودہ اور پُرسکون بناتے ہیں اور وہ آسانی سے آپ کے ہم خیال بن جاتے ہیں۔ اس سچائی کے ساتھ اپنے جذبات کو بھی شامل کریں، اور پھر وہ طریقے اور منصوبے بتائیں جن پر عمل کر کے مسائل کا حل تلاش کیا جا سکتا ہے۔

خطابت کے لیے کہانی کسی بھی مقرر کا سب سے کارآمد ہتھیار ہوتا ہے۔ کوئی دلچسپ واقعہ، کہانی یا حکایت پھیکے مواد کو رنگ بخش دیتی ہے۔ کہانی لوگوں کی توجہ کو فوراً اپنی طرف مبذول کر لیتی ہے۔ اگر توجہ نہ رہی ہو تو کہانی بیان کر کے اسے دوبارہ بحال کیا جا سکتا ہے۔

کہانی کے برمحل استعمال سے سامعین کو مؤثر انداز میں موضوع کی طرف ترغیب دی جا سکتی ہے۔ موقع محل کے مطابق کہانی سنجیدہ بھی ہو سکتی ہے، اور پُرمزاح بھی۔

بلاعنوان

اس تصویر کا اچھا سا عنوان تجویز کیجیے اور 500 روپے کی کتب لیجیے۔
عنوان بھیجنے کی آخری تاریخ 10/اپریل 2015ء ہے۔

مارچ 2015ء کے ''بلاعنوان کارٹون'' کے لیے جو عنوانات موصول ہوئے، اُن میں سے مجلسِ ادارت کو جو عنوانات پسند آئے، اُن عنوانات میں سے یہ ساتھی بہ ذریعہ قرعہ اندازی 500 روپے کی انعامی کتب کے حق دار قرار پائے۔

- یہ استقبالِ بہار ہے صاحب جنگل میں منگل کا سماں دِکھتا ہے (محمد قمر الزمان صائم، خوشاب)
- مزہ بھی بچت بھی کام بھی آرام بھی (آمنہ رمضان، فیصل آباد)
- اونٹ جی کیوں ہوتے ہو پریشان یہ کھیل کا ہے نیا میدان (عذرہ سعید، چکوال)
- نرالے ہیں انداز ہمارے (سعید الرحمٰن، شیخوپورہ)
- اب نہ کہنا ''تیری کون سی کل سیدھی'' (ایمن فاطمہ، ملتان)

علشبہ وسیم، لاہور (پہلا انعام: 195 روپے کی کتب)

لیلیٰ جلیل، نوشہرہ (دوسرا انعام: 175 روپے کی کتب)

اسامہ ظفر راجا، جہلم (تیسرا انعام: 125 روپے کی کتب)

محمد قاسم، خانیوال (چوتھا انعام: 115 روپے کی کتب)

آمنہ شاہد، لاہور (پانچواں انعام: 95 روپے کی کتب)

کچھ اچھے مصوروں کے نام بہ ذریعہ قرعہ اندازی: علیین کشف، لاہور۔ احمد یار، لاہور۔ ماہ نور خان، اسلام آباد۔ ویلجا فاطمہ، تلہ گنگ۔ ہادیہ مسعود، اٹک۔ بریرہ فاروق، وزیر آباد۔ آمنہ نور، بحریہ فاؤنڈیشن۔ حبیبہ مجید۔ سلمان طاہر، گوجرانوالہ۔ خاور اقبال، میانوالی۔ مریم ہاشم، لاہور۔ عاتکہ قاسم، لاہور۔ قدر ڈار، گوجرانوالہ۔ ثمرہ غفار، رحیم یار خان۔ ایمان ڈار، ہاجرہ ڈار، گوجرانوالہ۔ فروا عبدالرحمن، لاہور۔ زین العابدین، رحیم یار خان۔ جویریہ یونس، لاہور۔ محمد عرفان آفریدی، خیبر ایجنسی۔ شہباز قریشی۔ عبداللہ نوید، لاہور۔ ماہم ظفر، لاہور۔ محمد عثمان غنی، بہاول پور۔ محمد شکیب مسرت، بہاول پور۔ عفیفہ مغل، گجرات۔ حافظ احمد محمود، راول پنڈی۔ وجیہہ بابر، بھلوال۔ حیدر علی، لاہور۔ طیبہ طاہر، ثریا شاہین، بہاول پور۔ محمد شاہد۔ اذکی آصف، پشاور۔ محمد ضرار نوید، راول پنڈی۔ نصیبہ ناز، منیبہ ناز، ہری پور ہزارہ۔ عائشہ مشتاق، منڈی بہاؤالدین۔ محمد عبداللہ لطیف، مرید کے۔

ہدایات: تصویر 6 انچ چوڑی، 9 انچ لمبی اور رنگین ہو۔ تصویر کی پشت پر مصور اپنا نام، عمر، کلاس اور پورا پتا لکھے اور اسکول کے پرنسپل یا ہیڈ مسٹریس سے تصدیق کروائے کہ تصویر اسی نے بنائی ہے۔

اپریل کا موضوع
میلہ چراغاں
آخری تاریخ 8 اپریل

مئی کا موضوع
ریلوے اسٹیشن
آخری تاریخ 8 مئی